ذاکر شام غریباں عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین مجتہد طاب ثراہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ



یہ مضمون سرکار سید العلماءؒ نے عمدۃ العلماءؒ کی رحلت پر تحریر فرمایا تھا مگر مختصر تھا جو امامیہ مشن لکھنؤ اور جریدہ ''خطیب'' پاکستان میں علامہ سید محمد رضی آل نجم العلماء نے کتابچہ کی صورت میں شائع کیا تھا بعد میں اس مضمون میں سید العلماء نے کافی اضافے فرما دیئے تھے اور شاید اضافہ شدہ مضمون شائع نہیں ہوا لہٰذا اسے ضرورتاً پیش کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ بہت سی جگہ تحریر پڑھنے میں دشواریاں رہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مضمون طباعت کی منزل طے کر کے پڑھنے والوں کے سامنے ہے۔ (ادارہ)

خاندانی سلسلہ

جناب غفران مآبؒ آیۃ اللہ مولانا سید دلدار علی طاب ثراہ کے پانچ بیٹے تھے:۔

۱۔ سلطان العلماء قبلہ وکعبہ آیۃ اللہ سید محمد رضوان مآبؒ

۲۔ سید المفسرین آیۃ اللہ مولانا سید علی طاب ثراہ

۳۔ آیۃ اللہ مولانا سید حسن طاب ثراہ

۴۔ آیۃ اللہ مولانا سید مہدی طاب ثراہ

۵۔ سید العلماء آیۃ اللہ مولانا سید حسین عرف جناب میرن صاحب قبلہ علیین مکانؒ

رابع الذکر یعنی جناب سید مہدی صاحب لکھنؤ میں ۱۲۰۸ھ میں متولد ہوئے جب کہ جناب غفران مآبؒ کا آفتاب مرجعیت خط نصف النہار پر تھا اس لئے کہ اس وقت غفران مآبؒ کے قیام لکھنؤ اور ارتقائے شیعیت کے آغاز کو جو رجب ۱۲۰۰ھ میں لکھنؤ کی سب سے پہلی شیعہ نماز جمعہ وجماعت کے قیام سے ہوا تھا آٹھ برس گذر چکے تھے۔ انھوں نے تکمیل علوم عقلیہ ونقلیہ اپنے والد ماجد نیز بڑے بھائی جناب سلطان العلماء سے فرمائی اور کم سنی ہی میں بڑے علمی مرتبہ پر فائز ہوئے مگر صرف ۲۳ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کی زندگی میں ذی الحجہ ۱۲۳۱ھ میں انتقال

کیا۔ جناب غفران مآبؒ پر اس صدمہ کا شدید اثر ہوا اور اسی میں آپ نے "مُسَکِّنُ الْقُلُوْبِ عِنْدَ فَقْدِ الْمَحْبُوْبِ" کتاب تصنیف فرمائی جس کا قلمی نسخہ لکھنؤ کے کتب خانہ جناب جنت مآبؒ ممتاز العلماء طاب ثراہ میں موجود ہے۔

آپ نے صرف ایک فرزند کو بطور یادگار چھوڑا۔ یہ جناب صدر الشریعہ عمدۃ العلماء (الاول) آیۃ اللہ مولانا سید محمد ہادی تھے جو ۷/رجب ۱۲۲۸ھ کو لکھنؤ میں متولد ہوئے اور ابھی صرف تین ہی سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپ کی پرورش آپ کے جد امجد جناب غفران مآبؒ نے فرمائی مگر سات برس کے ہوئے تو ۱۹/رجب ۱۲۳۵ھ کو آپ کے سر سے دادا کا سایہ بھی اٹھ گیا جس کے بعد آپ کے عم معظم جناب سلطان العلماء نے آپ کی تعلیم و تربیت فرمائی اور تکمیل علوم اپنے چھوٹے چچا جناب سید العلماء علیین مکانؒ سے فرمائی چنانچہ ۱۲۶۲ھ میں ان دونوں بزرگواروں نے اجازات اجتہاد مرحمت فرمائے۔ جو اسی زمانہ میں شاہی مطبع میں طبع ہوئے۔ اِرْشَادُ الْمُؤْمِنِیْنَ در ارض تِسْعِیْن اور کَشْفُ الْاَسْتَار وغیرہ متعدد کتب آپ کے تصانیف سے ہیں۔ متعدد افاضل نے آپ سے تحصیل علم بھی کی چنانچہ مصنف تاریخ العلماء نے دو نام خصوصیت سے درج کئے ہیں۔ ایک جناب مولانا سید اعجاز حسین صاحب کنتوری (مصنف شذور العقیان و کشف الحجب برادر اوسط جناب علّامہ سید حامد حسین مصنف عبقات) اور دوسرے مولانا سید مہدی بن نجف علی رضوی مصنف تذکرۃ العلماء۔ عہد امجد علی شاہ میں صدر الصدور کا عہدہ آپ کو تفویض ہوا اور "عمدۃ العلماء صدر الشریعۃ" کا خطاب ملا۔ ۱۲۷۸ھ میں تقریباً پچاس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

جناب عمدۃ العلماء مذکور کی شادی اپنے عم اکبر جناب سلطان العلماء کی زوجۂ اولیٰ کے بطن کی سب سے چھوٹی صاحبزادی عالمۂ علوم اہلبیتؑ محترمہ جناب امۃ الزہراء بیگم صاحبہ سے ہوئی تھی جن سے دو فرزند تھے:۔

۱۔ جناب آیۃ اللہ سید محمد مہدی صاحب۔ یہ بھی مرتبہ رفیعۂ علم پر فائز تھے۔

۲۔ جناب عماد العلماء آیۃ اللہ سید مصطفی عرف میر آغا صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہٗ۔

ان کے علاوہ دو صاحبزادیاں تھیں جن میں سے ایک جناب مولانا باقر حسین صاحب فرزند زین العلماء مولانا سید علی حسین صاحب بن سید العلماء علیین مکانؒ کو منسوب ہوئیں جن کے فرزند نرھئی کے مشہور رئیس جناب نواب مولانا سید اصغر حسین صاحب فاخرؔ تھے۔ اور دوسری صاحبزادی جناب مولانا سید کلب عابد صاحب جائسی کو منسوب ہوئیں جن کے خلف الصدق سرکار قدوۃ العلماء مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ طاب ثراہ تھے۔

جناب عماد العلماء میر آغا صاحب قبلہ اپنے دور کے مرجع تقلید مسلم الثبوت فقیہ تھے۔ ان کی ولادت لکھنؤ میں ربیع الاول ۱۲۵۲ھ میں ہوئی جو لفظ "میر آغا" کے اعداد ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد اور بڑے بھائی سے حاصل فرمائی۔ پھر علوم عقلیہ جناب خلاصۃ العلماء آیۃ اللہ سید مرتضیٰ فرزند سلطان العلماء طاب ثراہ سے حاصل کئے

اور فقہ واصول کی تکمیل جناب ممتاز العلماء فخر المدرسین آیۃ اللہ سید تقی صاحب قبلہ سے فرمائی۔ ۱۱/ ماہِ صیام ۱۳۲۳ھ کو ۷۱/ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

جناب عماد العلماء کی علاوہ صاحبزاوں کے دو صاحبزادیاں تھیں۔ جن میں سے ایک جناب قدوۃ العلماء آیۃ اللہ سید آقا حسن صاحب قبلہ کو منسوب ہوئیں اور دوسری دعبل ہند جناب مولانا ذاکر مرحوم کو یہ دونوں صاحبزادیاں ایک ہی ماں کے بطن سے تھیں۔ ان کے علاوہ بعض صاحبزادیاں دوسری ماؤں کی تھیں۔

اس طرح جناب قدوۃ العلماء اپنے پیش رو جناب عماد العلماء میر آغا صاحب قبلہ کے حقیقی بھانجے بھی تھے اور داماد بھی اور اسی لحاظ سے آپ جناب عماد العلماء کی وفات کے بعد ان کے جانشین تسلیم کئے گئے۔

جناب قدوۃ العلماء کے آباء واجداد میں بھی کئی پشت سے برابر علم چلا آرہا تھا چنانچہ آپ کے مورثان اعلیٰ میں سے ایک ملّا سید محمد یوسف صاحب جائسی دہلی میں بہادر شاہ اول کے استاد تھے اور پردادا جناب مولانا سید محمد ولی حسین مجتہد تھے ان کے فرزند جناب مولانا سید کلب حسین صاحب قریب باجتہاد تھے جن کے فرزند مولانا سید کلب عابد صاحب بھی جو جناب قدوۃ العلماء کے والد بزرگوار تھے امام جمعہ وجماعت تھے۔

جناب قدوۃ العلماء کی ولادت ۲۶/ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کتب درسیہ کی جناب مولانا سید سبط محمد صاحب ابن خلاصۃ العلماء سید مرتضیٰ صاحب سے حاصل کی اور پھر معقولات ومنقولات کی تکمیل جناب بحر العلوم علّن صاحب قبلہ اور اپنے خال معظم جناب عماد العلماء سے فرمائی۔

۱۳۱۹ھ میں آپ نے انجمن صدر الصدور قائم فرمائی جو ۱۳۲۳ھ میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی شکل میں آگئی۔ ۱۳۲۸ھ میں انجمن یادگارِ علماء قائم کی۔ جناب غفرانمابؒ کی شہرۂ آفاق کتاب عماد الاسلام کی تین جلدیں اور منتہیٰ الافکار وغیرہ آپ ہی کی توجہ سے طبع ہوئیں۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس سے علاحدگی کے بعد آپ نے ۱۳۴۷ھ میں شیعہ بیت المال قائم فرمایا اور پنجشنبہ ۷/ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۲/ ستمبر ۱۹۳۹ء میں تقریباً چھیاسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی اور اپنا جانشین عمدۃ العلماء آیۃ اللہ مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ کو چھوڑا جو جناب قدوۃ العلماء کے بہت سے بچوں میں تن تنہا زندہ رہے تھے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ جناب عمدۃ العلماء کا نسبی سلسلہ تین سمتوں سے جناب غفران مآبؒ کو پہنچتا ہے:۔

۱۔ عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ نبیرۂ جناب عماد العلماء میر آغا صاحب ابن عمدۃ العلماء سید محمد ہادی ابن جناب سید مہدی ابن غفران مآبؒ۔

۲۔ عمدۃ العلماء ابن قدوۃ العلماء مولانا سید آقا حسن صاحب نبیرۂ عمدۃ العلماء سید محمد ہادی صاحب الخ

۳۔ عمدۃ العلماء نبیرہ جناب عماد العلماء میر آغا صاحب نبیرۂ سلطان العلماء سید محمد صاحب ابن حضرت

غفران مآبؒ مولانا سید دلدار علی (اعلیٰ اللہ مقامہم اجمعین)

آپ کا ددھیالی شجرہ بھی جناب غفران مآبؒ طاب ثراہ کے شجرہ کے ساتھ جناب سید زکریا فاتح نصیر آباد کی ذات میں مجتمع ہوجاتا ہے۔

اس خاندان کے ناموں میں لفظ ''کلب'' کا کس طرح التزام ہوا اس کے لئے کوکب قدر صاحب لکھتے ہیں کہ: ''مولوی سید کلب حسین صاحب اپنے باپ مولوی سید ولی محمد کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ ان کی ولادت سے قبل اولاد زندہ نہ رہتی تھی۔ مرض ام الصبیان میں زچہ خانے کے اندر ہی فوت ہوجاتی تھی۔ جب اس بلند اقبال نے عزاخانہ دنیا میں اپنا قدم رکھا تو روز عاشور تھا۔ افراد خاندان مراسم عزا بجالانے میں منہمک تھے۔ والد ماجد اس دعا کے ساتھ ضریح مبارک کے نیچے ڈال کر رخصت ہوگئے کہ مولا اس عزادار کو بچا لیجئے۔ بچہ زندہ رہا تو اس کو کلب حسین کے نام سے یاد کیا۔'' (رسالہ ''الوداع اے زینت محراب و منبر الوداع'')

ولادت اور ابتدائی تربیت

آپ کی ولادت روز جمعہ ۶ رشعبان ۱۳۱۱ھ (۱۳ رفروری ۱۸۹۴ء) کو لکھنؤ میں ہوئی۔ چنانچہ تاریخی نام آپ کا ''علی اختر'' تھا۔ چونکہ جناب قدوۃ العلماء کے بائیس بچوں میں صرف یہ ایک تھے جو پروان چڑھنے والے تھے تو ولادت حضرت امام عصر عجل اللہ فرجہٗ کی تاریخ سے برکت حاصل کرنے کے لئے آپ کے والد ماجد جناب قدوۃ العلماء اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے اصل تاریخ ولادت سے ۹ دن آگے بڑھا کر آپ کی سالگرہ کے طور پر ۱۵ رشعبان کو عصر کے وقت ایک دعوت عام کی بناڈالی جس میں معززین شہر کے علاوہ کثیر التعداد غرباء بھی اس پرتکلف طعام میں شریک ہوتے تھے۔ بطور ایک کار خیر کے یہ دعوت خود جناب عمدۃ العلماء کے دور میں بھی اپنی اسی شان فیاضی ومساوات کے ساتھ قائم رہی جس کے متعلق یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ خود موصوف ہی کی ولادت کے سلسلہ میں قائم ہوئی تھی۔

جب جناب عمدۃ العلماء کی ولادت ہوئی ہے اس وقت لکھنؤ میں اس حلقہ سے جس میں آپ کے والد ماجد جناب قدوۃ العلماء محسوب تھے مقدم تر طبقہ کے متعدد علمائے اعلام موجود تھے جن میں آپ کے جدامجد جناب عماد العلماء کے علاوہ جناب تاج العلماء مولانا سید علی محمد صاحب قبلہ اور جناب ابّو صاحب قبلہ (والد باقر العلوم) اور جناب بحر العلوم مولانا سید محمد حسین عرف علّن صاحب قبلہ تھے۔ آپ کی ولادت کے ایک سال کے بعد ۱۳۱۲ھ میں جناب تاج العلماء کا انتقال ہوا اور ۱۳۱۶ھ میں جناب ابّو صاحب قبلہ کی وفات ہوئی لیکن آپ کے جدامجد جناب عماد العلماء آپ کی ولادت کے بعد بارہ سال تک حیات رہے اور آپ کو اتنی مدت تک جس میں بلوغ کی منزل کچھ زیادہ دور نہیں رہ جاتی ان کی تربیت کے برکات سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا۔

جناب عماد العلماء اپنے تمام معاصرین کے درمیان مسائل فقہیہ کے استحضار میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ اطراف وجوانب سے مسائل جو دستخط کے لئے آتے تھے ان کی یہ کثرت ہوتی تھی کہ مصنف تاریخ العلماء کے بیان کے مطابق جو خود جناب مغفور کے تلامذہ میں تھے، کبھی

کبھی آپ کی ڈاک یکہ پر بار کر کے ڈاکخانہ تک لے جائی جاتی تھی۔

اس وقت ماحول ایسا تھا کہ اکابر علماء کے مکانات میں درودیوار سے ہر وقت علمی صداؤں کی گونج سنائی دیتی تھی۔ جناب بحرالعلوم علّن صاحب قبلہ کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ وہ فرماتے تھے، جس طرح بڑھئی کے بچے کو بچپن سے ہر وقت کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس فن سے مانوس ہوجاتا ہے ویسے ہی ہمارے بچوں کے کانوں میں شروع سے مسائل فقہیہ پڑتے رہتے ہیں اس لئے بہت کچھ وہ بغیر پڑھائے ہوئے بھی پڑھ لیتے ہیں یہ بات غیر خاندانی علما کو حاصل نہیں ہوسکتی۔

اس دوران جب کہ آپ کی عمر چھ سات سال کی تھی ۱۳۱۸ھ میں شفیق ماں (دختر حضرت عمادالعلماء) کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور چند سال کے بعد ۱۳۲۱ھ میں آپ کے ماموں جناب مولانا سید زوّار حسین صاحب مرحوم کا۔ یہ دونوں داغ جناب عمادالعلماء کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئے اور ۱۳۲۳ھ میں جناب عمادالعلماء کا انتقال ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا جب عمدۃ العلماء درسی تعلیم کی منزلوں کو تیزی کے ساتھ طے کر رہے تھے۔

تحصیل علوم اور اساتذہ

پانچویں برس سرکار عمادالعلماء میر اغا صاحب طاب ثراہ کے ہاتھ سے بسم اللہ کی رسم ادا ہوئی۔ بقول کوکب قدر صاحب: ''اسی بسم اللہ کا یہ وہ دل نشین منظر تھا جو مدت العمر انھوں نے یاد رکھا اور اپنے روز نامچہ میں درج کیا۔''

ابتدائی تعلیم جناب مولوی حسن علی صاحب سے حاصل کی جو اس وقت عموماً افراد خاندان کے معلم ہوا کرتے تھے چنانچہ جناب عمدۃ العلماء سے مقدم طبقہ کے افراد مثلاً ممتاز العلماء آیۃ اللہ سید ابوالحسن صاحب قبلہ بلکہ ان کے برادرانِ بزرگ جناب آیۃ اللہ سید محمد تقی صاحب قبلہ مرحوم اور علامۂ ہندی آیۃ اللہ سید احمد صاحب قبلہ کے بھی پہلے استاد مولوی حسن علی صاحب مرحوم ہی تھے۔ جب درسیاتِ صرف ونحو کا دور آیا تو جیسا کہ اخبار سرفراز (۹/اکتوبر ۱۹۶۳ء) میں لکھا گیا ہے: ''آپ شروع میں مدرسۂ ناظمیہ میں داخل ہوئے اور اس تعلیم گاہ سے ۱۳۱۹ھ میں درجہ نہم پاس کر کے سلطان المدارس میں داخل ہوئے۔'' چونکہ آپ کے ایک خاندانی بزرگ جناب مولانا سید محمد سجاد صاحب ابن مولانا گدا حسنین صاحب ابن زبدۃ العلماء آیۃ اللہ سید علی نقی صاحب ابن سید العلماء ابن غفران مآبؒ سلطان المدارس کے مدرسین میں تھے اس لئے آپ ہدایۃ النحو کے درجے میں ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور پھر وہیں سے بالترتیب تمام امتحانات میں کامیابی حاصل کرتے ہوئے صدرالافاضل کا امتحان اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا۔

سلطان المدارس کے آپ کے اساتذہ میں ممتاز شخصیتیں حسب ذیل تھیں:۔

۱۔ مشہور منطقی اور استدلالی وعالمانہ فلسفی بیان والے خطیب مولانا سید محمد رضا صاحب جن کے شاگرد کی حیثیت سے فن ذاکری میں سید الخطباء مولانا سید ابن حسن صاحب نونہروی شہرت خاص رکھتے ہیں۔

۲۔ جناب ہادی الملۃ آیۃ اللہ سید ہادی صاحب قبلہ برادر باقر العلوم۔

۳۔ خود جناب باقر العلوم آیۃ اللہ سید باقر صاحب قبلہ طاب ثراہ۔

زمانۂ تعلیم سلطان المدارس کے دوران میں آپ نے اپنے والد ماجد جناب قدوۃ العلماء سے شرح لمعہ کتاب المیر اث اور تصریح شرح تشریح الافلاک نیز جناب ظہیر الملۃ آیۃ اللہ سید ظہور حسین صاحب قبلہ سے منطق میں ملّا جلال کے کچھ سبق اور جناب عمدۃ المحققین مولانا سید کاظم حسین صاحب قبلہ (آل غفران مآبؒ) اور اشرف الحکماء حکیم سید علی صاحب آشفتہؔ مرحوم سے معقولات کی اکثر کتابیں پڑھیں۔

یہ جماعت جس میں جناب عمدۃ العلماء طاب ثراہ صدرالافاضل پاس کر کے سلطان المدارس سے نکلے آپ کے علاوہ حسب ذیل افراد پر مشتمل تھی۔

۱۔ جناب سلطان الفقہاء آیۃ اللہ سید محمد عرف میرن صاحب قبلہ۔

۲۔ علّامہ سید عبدالحسین صاحب قبلہ مدرس معقولات جامعہ سلطانیہ۔

۳۔ جناب مولانا شاہ غلام حیدر صاحب۔

یہ دونوں بزرگوار حسین آباد شیخ پورہ ضلع سارن (بہار) کے باشندے تھے۔

۴۔ جناب مولانا حکیم فضل حسین صاحب جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد پہانی ضلع ہردوئی میں بحیثیت طبیب مقیم ہو گئے تھے اور وہیں چند سال ہوئے انتقال فرمایا۔

۵۔ جناب مولانا سید علی صاحب محمود آبادی جو صدرالافاضل ہونے کے بعد مدرسۃ الواعظین کے ابتدائی زمانۂ قیام میں سب سے پہلی جماعت میں جو ان کے علاوہ جناب مولانا سید عدیل اختر صاحب اور حافظ مولانا کفایت حسین صاحب اور مولانا سید خورشید حسین صاحب (برادر زادہ سرکار نجم الملۃ اعلی اللہ مقامہٗ) پر مشتمل تھی واعظ ہو کر نکلے اور صوبہ بنگال میں ان کا تقرر رہا۔ وقف حسینیہ ہُوگلی کے سلسلہ میں اس کو انگریزوں کے ناجائز تصرف سے نکال کر شیعوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کے لئے ان کی جانفشانی اور لگا تار محنت یادگار رہے مگر افسوس ہے کہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور اسی جدوجہد میں مصروف رہتے ہوئے بنگال میں ہی سفر کی حالت میں ریل پر داعی اجل کو لبیک کہی۔

۶۔ جناب مولانا مرزا محمد عابد صاحب محلہ توپ دروازہ لکھنؤ میں جناب مولوی مرزا محمد تقی صاحب مرحوم کے (جو فن ذاکری میں میر محمد شاہ صاحب مرحوم کے خاندان کے شاگرد تھے) فرزند تھے جو خود بھی قدیم طرز پر ذاکری فرماتے تھے۔

۷۔ حکیم مولوی علی ابراہیم صاحب موہانی جو یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بمبئی چلے گئے اور وہاں کامیابی کے ساتھ مطب اور دواخانہ قائم کیا۔

سوا موخر الذکر بزرگوار کے جن کے متعلق کچھ علم نہیں ہے باقی یہ پورا کاروان عالم آخرت کی طرف رہ سپار ہو چکا جن میں سے جناب مولانا میرن صاحب قبلہ اور مولانا

سید عبدالحسین صاحب قبلہ استاد معقولات کے ساتھ جناب عمدۃ العلماء کے انتہائی برادرانہ تعلقات تھے جن میں ان حضرات کے شریک وسہیم بلکہ ان سے مقدم صرف خطیب اکبر سید الواعظین مولانا سید اولاد حسین صاحب شاعر عرف مولوی للّن صاحب قبلہ مرحوم سمجھے جاسکتے ہیں جو جناب مرحوم کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے۔ ان تینوں بزرگواروں کے انتقال کا صدمہ جناب عمدۃ العلماء کو یقیناً اتنا ہی ہوا ہوگا جتنا ان کے سگے بھائی اگر ہوتے اور دنیا سے ان کے سامنے رحلت کرتے تو انھیں صدمہ ہوتا۔ ان حضرات کے بعد جناب عمدۃ العلماء ایک طرح سے اپنے کو تنہا محسوس کرنے لگے ہوں گے۔ صد افسوس کہ وہ بھی آج اس کاروانِ گذشتہ سے ملحق ہو گئے اور ان کے ساتھ ایک پورا دور ختم ہو گیا۔

سوا سرکار سید الفقہاء آیۃ اللہ مفتی سید احمد علی صاحب قبلہ (مَتَّعَنَا اللّٰہُ بِطُوْلِ بَقَائِہٖ) کے لکھنؤ میں اور سرکار آقا شیخ محمد حسن نجفی مدظلہ کے بمبئی میں یہ دونوں بزرگوار جناب عمدۃ العلماء سے مقدم تر طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں باقی کوئی فرد طبقۂ علماء بلکہ واعظین میں بھی اب ایسی نہیں رہ گئی جو جناب عمدۃ العلماء سے باعتبار عمر وطبقہ خردی کی نسبت نہ رکھتی ہو۔

پہلی شادی

ابھی آپ نوجوانی کے ابتدائی حدود میں تھے کہ جائس کے ددھیالی سلسلہ کے اعزاء میں سے جناب میر ولی حسین صاحب کی صاحبزادی کے ساتھ آپ کا عقد ہو گیا جن سے صرف ایک صاحبزادی متولد ہوئیں (جو جناب عماد العلماء آیۃ اللہ سید محمد رضی صاحب نبیرۂ سرکار نجم الملۃ کو منسوب ہوئیں) مگر چند سال کے بعد بچی کو کمسن چھوڑ کر ان محترمہ کا انتقال ہو گیا جس کا جناب عمدۃ العلماء کو فطری طور پر شدید صدمہ ہونا ہی چاہئے تھا۔

ابتدائے ذاکری

کوکب قدر صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۳۳۱ھ میں امام باڑہ غفران مآبؒ میں ان کی ذاکری کی ابتداء ہوئی۔ بیس برس کا سن تھا۔ ممکن ہے کہ یہ اس مبتدیانہ قسم کی ذاکری کا آغاز ہو جو بطور پیش خوانی ہوتی ہے مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے مستقل طور پر جناب غفران مآب طاب ثراہ کے امام باڑے میں ۱۳۳۶ھ سے ذاکری شروع فرمائی۔ اس وقت آپ کے استاذ معظم جناب مولانا سید محمد رضا صاحب اور خطیب آل محمد جناب مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ آسمان ذاکری کے ماہتاب وآفتاب سمجھے جارہے تھے۔ آپ نے اپنا طرز ذاکری ان حضرات سے علاحدہ رکھا جو ابتدا ہی سے مقبول ہونے لگا چنانچہ حسینیۂ جناب غفران مآب طاب ثراہ کی مجلسیں جو اس کے پہلے مجمع کے اعتبار سے ٹوٹ گئی تھیں اب آپ کے بیانات کی وجہ سے جم گئیں اور اس وقت سے برابر سوا ان چند برسوں کے جب آپ عتبات عالیات میں تھے اور سوا اس سال کے جب کہ آپ بستر بیماری پر تھے جو صد افسوس کہ بالآخر بستر مرگ ثابت ہوا باقی ہر سال پابندی کے ساتھ آپ اس عشرہ میں بیان فرماتے رہے۔

ذوق شاعری

جیسا کہ جناب کوکب قدر سجاد علی مرزا صاحب

ایم۔اے۔، ایل۔ایل۔بی۔نے لکھا ہے:

''خاندان اجتہاد کے علمی وادبی خدمات کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے مقابلے میں اس خاندان نے شعروادب یعنی اردو زبان کی جو خدمت انجام دی ہے اس کا بہت کم اعتراف کیا گیا ہے اور ایسے تذکرے بہت کم (بلکہ بالکل نہیں) نظر آئیں گے جن میں اس خاندان کے ممتاز شعراء اور ادباء ماہرؔ، خورشیدؔ، حسینؔ، فاخرؔ، جاویدؔ، ذاخرؔ، آشفتہؔ، تمناؔ، ہدفؔ، شاعرؔ، اخترؔ وغیرہ کا مفصل ذکر ملے۔حالانکہ بنظر انصاف دیکھیئے تو دبستان انیسؔ اور دبستان دبیرؔ کے ساتھ ساتھ اس خاندان میں بھی بے مثل شاعر اور مرثیہ گو پیدا ہوئے اور زبان کی تراش وخراش میں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ان کا یہ کارنامہ اس لحاظ سے زیادہ قابل تعریف ہے کہ یہ لوگ اکبرآباد یا شاہجہاں آباد سے ہجرت کر کے نہیں آئے تھے بلکہ لکھنؤ میں زبان کے چٹخارے سے واقف ہوئے اور جس زبان میں اپنے کمالات کے جوہر دکھائے وہ درحقیقت اسی زمین کی ساختہ وپرداختہ اور سند کئے جانے کی زیادہ مستحق ہے۔''

جناب قدوۃ العلماء طاب ثراہ کے بالکل قریبی اعزا میں ایک طرف جناب مولانا فاخرؔ طاب ثراہ تھے جو آپ کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے۔دوسری طرف جناب مولانا ذاخرؔ اعلیٰ اللہ مقامہٗ تھے جو آپ کے ہم زلف تھے یعنی جناب عمادالعلماء کی ایک صاحبزادی جناب قدوۃ العلماء کو منسوب تھیں اور ایک جناب ذاخرؔ کو۔ چنانچہ جناب قدوۃ العلماء بھی شاعری کا مذاق رکھتے تھے اور متعدد سلام اور نوحے آپ کے تصنیف فرمودہ تھے۔

آپ سال میں ایک مجلس مرثیہ خوانی کی ۲۹/رجب کو حسینیۂ جناب غفران مآبؒ میں خاص اہتمام سے منعقد فرماتے تھے جس میں جناب ذاخرؔ مرحوم اپنا نوتصنیف مرثیہ پڑھتے تھے۔

جناب عمدۃ العلماء کا بچپن میں جن کا ساتھ تھا وہ لسان الشعراء مولانا اولاد حسین صاحب شاعرؔ تھے جو آپ کے خالہ زاد بھائی تھے اور ابوالمعارف جناب مولوی رازؔ اجتہادی (خلف بحرالعلوم جناب مولانا علّن صاحب قبلہ)۔

اسی ماحول کا نتیجہ ہے کہ جناب عمدۃ العلماء کو بھی بچپن ہی سے شاعری کا ذوق تھا جس میں اپنے خالو جناب ذاخرؔ اعلیٰ اللہ مقامہٗ سے اصلاح لی اور چند قصیدے اور بکثرت غزلیں اور کچھ نوحے نظم فرمائے۔

پرنس کوکب قدر صاحب لکھتے ہیں:

''افسوس کہ جو انتخاب ہماری نظر سے گذرا وہ وہی ہے جو سرکار مرحوم نے اپنی بیاض میں حافظہ کے سہارے سپرد قلم کیا اور یہ تحریر بھی کوئی چالیس سال قبل کی ہے۔صرف ۱۹۸/شعر ہیں۔اس میں کوئی مطلع ہے تو کوئی مقطع اور کوئی شعر، مکمل غزل کوئی نہیں۔''

چند شعر کوکب قدر صاحب نے اس بیاض سے منتخب کر کے درج کئے ہیں حسب ذیل ہیں:

اب غم نہ رہا، آہیں نہ رہیں، نالے نہ رہے، الجھن نہ رہی
دل جاتے ہی سوز الفت کی ایک ایک نشانی ختم ہوئی

جو کچھ تھا بہت تھا جیتے جی، جب میں نہ رہا پھر کچھ نہ رہا
منھ پھیر کے دنیا یوں سوئی جیسے کہ کہانی ختم ہوئی

کیوں کھلیں چادر کی کلیاں، کیوں کیا بلبل نے شور
ہم لحد میں ہیں تو تربت پر بہار آنے سے کیا

خلق عالم ہے کرشمہ عشق کی تاثیر کا
آسماں اک تنگ حلقہ ہے مری زنجیر کا

اڑتے پھرتے ہیں چمن میں مرے ٹوٹے ہوئے پر
ڈھونڈتی پھرتی ہے یوں قوت پرواز مجھے

کوئی پوچھے ساکنان قبر سے
درددل اب بھی ہے یا آرام ہے؟

ایک شعر آپ کا جسے آپ کے بزرگ عزیز جناب مولانا حکیم آشفتہ صاحب نے سن کر بہت پسند فرمایا حسب ذیل ہے:

خطاؤں پر خطائیں اس طرف تھیں ناوک افگن سے
ادھر تیروں سے بنتا جارہا تھا آشیاں اپنا

ایک مقطع آپ کا جو اس وقت کے حسب حال ہے ملاحظہ ہو:

ہائے اختر تجھے خدا بخشے
تیری ہر بات یاد آتی ہے

اختر آپ نے اپنے تاریخی نام میں سے ایک جُز لے کر اپنا تخلص قرار دیا تھا۔

ایک فارسی قطعہ آپ نے اپنے وصیت نامہ میں لوح قبر کے لئے تحریر فرمایا ہے:

شادم که من گزشتم وذکرم گزاشتم
قائم ازیں حسینیه نام ونشان من
کلب حسین بودم ونازم بخدمتش
غافل نه شد ز ذکر حسینم زبان من

سجاد علی مرزا صاحب نے ایک نوحہ بھی نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:

ستم ہزاروں ہوئے سبط مصطفیٰؐ کے لئے
بلا کے شاہ کو مہماں کیا جفا کے لئے
حسینؑ ہاتھوں پہ اصغرؑ کو لے کے کہتے تھے
پلا دو پانی مرے لال کو خدا کے لئے
جواب ملتا تھا پانی نہ دیں گے ہم اس کو
گلا صغیر کا ہے ناوکِ قضا کے لئے
صدا یہ شاہ نے دی دودھ ماں کا خشک ہوا
یہ بچہ آیا ہے پانی کی التجا کے لئے
کہا یہ شمر نے دریا سے جانور پی لیں
ہے بند آب بن سبطِ مصطفیٰؐ کے لئے
کوئی الم نہ ہو اختر کو جُز غم شہ دیں
ہوا ہی خلق یہ دل شاہ پر بُکا کے لئے

سپہ گری

خاندان جناب غفران مآبؒ میں یہ ایک فن بھی رہا

کیا جو حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ کی طرف انتساب سے ''علی بند'' کہلاتا ہے۔

جناب سلطان العلماء کے فرزند جناب خلاصۃ العلماء آیۃ اللہ سید مرتضیٰ صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ (استاد علّامہ سید حامد حسین صاحب قبلہ مصنف عبقات) خاندان میں اس فن کے استاذ الاساتذہ سمجھے جاسکتے ہیں۔ ان کے بعد ان کے بھائی (سلطان العلماء کے ایک اور بیٹے) جناب مولانا محمد علی صاحب اپنے زمانہ میں اس فن کے استاد ہوئے۔

ان کے دو فرزند تھے جو دونوں باکمال اساتذہ فن میں تھے۔ ایک جناب مولانا ابّن صاحب اور دوسرے جناب مولانا منّے صاحب۔ ان کے شاگردوں میں جو حضرات منزل کمال پر پہنچے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ جناب کہف العلماء آیۃ اللہ مولانا سید ابن حسن صاحب قبلہؒ

۲۔ جناب مولوی سید نظیر حسین صاحب شیدؔا عرف بڑے صاحب خلف اکبر جناب نواب مولانا سید مہدی حسین صاحب ماہرؔ مرحوم۔ (ابن زین العلماء مولانا سید علی حسین ابن سید العلماء مولانا سید حسین علیین مکان)

۳۔ جناب مولانا سید علی حسن صاحب (ابن زبدۃ العلماء جناب ممتاز العلماء سید تقی صاحب قبلہ جنت مآب ابن سید العلماء)

۴۔ جناب ممتاز العلماء آیۃ اللہ سید ابوالحسن عرف منّن صاحب قبلہ۔ ان میں سے جو حضرات علماء تھے (کہف الملۃ اور ممتاز العلماء طاب ثراہما) وہ اپنے فرائض علمی کی وجہ سے باقاعدہ اس فن کی سرپرستی سے مجبور تھے اور جناب سید نظیر حسین صاحب اپنے والد مرحوم کے انتقال کے بعد معاشی انقلابات سے پریشانیوں کا شکار ہوکر اس طرف متوجہ نہ رہ سکے لیکن جناب مولوی سید علی حسن صاحب مرحوم باقاعدہ اس فن کی اشاعت اور شاگردوں کی تربیت میں مصروف رہے۔

جناب عمدۃ العلماء نے ابتدائی تحصیل اس فن کی جناب ابّن صاحب اور منّے صاحب سے فرمائی لیکن ان دونوں بزرگوں کا آپ کے آغاز شباب ہی میں انتقال ہوگیا تو آپ نے اس کی تکمیل جناب مولانا علی حسن صاحب مرحوم اور جناب ممتاز العلماء مولانا سید ابوالحسن صاحب قبلہ سے فرمائی جس میں آپ کے رفیق وسہیم ابوالمعارف جناب مولوی سید دلدار علی عرف منّے آغا صاحب رازؔ اجتہادی مدظلہ (خلف جناب بحرالعلوم آیۃ اللہ سید محمد حسین علین صاحب قبلہ) رہے۔ آپ کے اساتذہ ان دونوں صاحبوں کو امتیازی نظر سے ملاحظہ فرماتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ مرتضیٰ پافم کا یادگار ہے۔ یہ روسی فوج میں کارہائے نمایاں کئے ہوئے ایک تیغ زن تھا جو کچھ عرصہ تک کلکتہ وغیرہ میں قیام کرکے اردو زبان سے بھی واقف ہوگیا تھا۔ اس کے پاس کئی تلواریں سونے کے قبضے کی تھیں جو اسے فوجی تعلق کے زمانے میں انعامات میں ملی تھیں۔ ریٹائرڈ ہونے کے لئے بعد اس نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کرکے اپنے سپہگری کے کمالات کا

مظاہرہ کیا۔

لکھنؤ آ کر اسے کسی طرح یہ معلوم ہوا کہ خاندان غفران مآبؒ کو سپہگری کا ذوق ہے تو وہ جناب قدوۃ العلماء طاب ثراہ کے پاس آیا اور آپ سے کہا کہ اپنے صاحبزادہ اور خاندان کے دوسرے بچوں کو میرا شاگرد کر دیجئے تو میں ان کو سپہگری کے فن کی تعلیم دے دوں۔ جناب قدوۃ العلماء کو اس کی یہ پیشکش اپنے خاندان کے فنی وقار کے خلاف معلوم ہوئی اور فرمایا کہ میں اپنے خاندان کے طریقۂ جنگ سے آپ کی لڑائی کا موازنہ کروں گا۔ اگر میرے یہاں کے طریقۂ جنگ سے آپ کی تیغ زنی بہتر ثابت ہوگی تو مجھے آپ کی فرمائش کی تعمیل میں عذر نہیں ہے۔ اس نے اس پر آمادگی ظاہر کی چنانچہ جناب قدوۃ العلماء نے جناب ممتاز العلماء کو طلب فرما کر یہ واقعہ بیان کیا۔ یہاں خاندان جناب غفرانمآبؒ میں جو علماء اس فن میں کمال رکھتے تھے وہ اس کے پابند رہے تھے کہ عموماً سوا اعزاء یا خاص الخاص افراد کے جو مثل اعزاء ہوں باقی اغیار کے سامنے اور عام مجمع میں مظاہرۂ فن نہیں فرماتے تھے اور اس وقت مقصود یہ تھا کہ ایک اجتماع ہو جس میں دونوں طریقہ ہائے فن کا مقابلہ ہو اس لئے جناب ممتاز العلماء نے مودّبانہ معذرت فرمائی اور کہ اس کے لئے جناب مولانا علی حسن صاحب کو اطلاع دی جائے مگر اتفاق وقت کہ اس موقع پر جناب علی حسن صاحب کی ران میں پھوڑا تھا جس کی وجہ سے وہ کھڑے ہونے سے معذور تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں اس موقع پر موجود رہوں گا مگر خود لڑنے سے مجبور ہوں۔ اب کوئی صورت نہ تھی۔ جناب قدوۃ العلماء طاب ثراہ نے ارشاد فرمایا کہ میں تو مرتضیٰ پافم کو قول دے چکا ہوں، اب میری بات جائے گی۔ مجبوراً جناب ممتاز العلماء اپنے بڑے بھائی کے احترام کی بنا پر تیار ہو گئے۔ بارہ دری میں جس کے کمرے میں جناب قدوۃ العلماء اور پھر عمدۃ العلماء نماز جماعت ادا فرمایا کرتے تھے باہر کے صحن میں اجتماع ہوا۔ اس طرف اساتذہ میں جناب ممتاز العلماء کے علاوہ جناب مولانا علی حسن صاحب مرحوم اور جناب سید نظیر حسین عرف بڑے صاحب مرحوم بھی موجود تھے۔

پہلے جناب ممتاز العلماء نے بطور نمونہ اپنے ایک کمسن شاگرد کے ساتھ قرول کا ایک ٹکڑا لڑ کر دکھایا جس میں ہاتھ کی صفائی اور پھرتی سے مرتضیٰ پافم بہت متاثر ہوئے۔ تعریف کی اور صاحبزادہ کو گلے سے لگا لیا۔

اب حریفانہ جنگ (چھوٹ) کا نمونہ پیش ہونے کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے جناب ممتاز العلماء کے ساتھ کوئی دوسرا استاد فن ہونا چاہئے تھا جس کے لئے مولانا علی حسن صاحب کی معذوری کی وجہ سے جناب مولوی سید نظیر حسین صاحب کو کھڑا ہونا پڑا۔ اب یہ برابر کا مقابلہ تھا۔ جناب نواب سید نظیر حسین صاحب کی رعب دار صورت کے ساتھ ان کا شیرانہ ٹھاٹھ دیکھنے کی چیز تھا مگر ممدوح مدت دراز سے چھوڑے ہوئے تھے اس لئے بہت جلد سانس نے جواب دے دیا۔ بہرحال اس مختصر مدت میں بھی جو کمال فن کے جوہر سامنے آ گئے وہ کافی تھے۔

اب مرتضیٰ پافم نے اپنے دو ساتھیوں سے جنھیں وہ

ہمراہ لائے تھے اپنی جنگ کا نمونہ پیش کیا جس میں ہاتھوں کی تیزی ضرور خاص امتیاز رکھتی تھی مگر اہل نظر نے دونوں طرف کے واروں کے مسلسل تبادلہ کے متعلق رائے یہ قائم کی کہ وار اوچھے ہوتے ہیں اور ہاتھ میں کھنچاؤ نہ ہونے کی وجہ سے حریف پر کاری ضرب نہیں آسکتی برخلاف ''علی بند'' کے اس طریقۂ جنگ کے جس پر اکابر خاندان کا عمل ہے کہ اس میں ہاتھ کے کھنچاؤ اور اس کی قوت پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔

مجمع کے تاثرات سے خود پافم نے محسوس کرلیا کہ میری فوقیت نمایاں نہیں ہوئی اس لئے اب انھوں نے جناب قدوۃ العلماء سے پھر کوئی تحریک مناسب نہیں سمجھی۔ ایک دن ان کے فرزند (جناب عمدۃ العلماء) کے پاس جب کہ وہ کیلے والے مکان میں باہر اکیلے بیٹھے ہوئے تھے وہ آ گئے اور کہنے لگے میں نے آپ کے والد صاحب سے کہا تھا کہ وہ آپ کو میرا شاگرد بنا دیں مگر انھوں نے توجہ نہ فرمائی۔ اب آپ ان سے کہہ کر میرے شاگرد ہوجایئے۔ جناب عمدۃ العلماء نے فرمایا کہ والد ماجد نے جو شرط قرار دی تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ آپ کا طریقۂ جنگ ہمارے طریقہ سے بہتر ثابت نہیں ہوا اور اگر آپ کو اس کے بعد بھی اصرار ہے تو میں ابھی پھر گنکا (تیغ وسپر) لاتا ہوں۔ خود میرے آپ کے درمیان مقابلہ ہوجائے۔ اگر آپ مجھ پر غالب آئے تو میں آپ کا شاگرد ہوجاؤں گا۔ وہ اس پر تیار ہوگئے اور مقابلہ ہوگیا۔ اس موقع کی تفصیل پرنس کوکب قدر صاحب نے اس طرح درج کی ہے:

''سرکار مرحوم کی مشق ایک عرصہ سے چھوٹی ہوئی تھی لیکن اپنی ذہانت اور مہارت سے اس پر غالب رہے اور وہ یوں کہ وہ شخص پھری (ڈھال) کے بجائے ہرن کے سینگ درمیان سے پکڑ کر مخالف کے گنکے (تلوار) کو اس میں اُلجھا لیتا تھا اور موقع ملتے ہی چوٹ کر جاتا تھا۔ سرکار مرحوم نے اس کے طریق کار کا بغور مشاہدہ کرتے ہوئے قابل تعریف سرعت سے اور صفائی کے ساتھ دوشاخے کے بیچ سے انگلیوں پر ضرب لگائی اور کامیاب رہے۔''

پیراکی

کوکب قدر صاحب کے بیان کے مطابق پیراکی کے فن کی تعلیم آپ نے خلیفہ رضا حسین صاحب سے حاصل کی۔ وہ لکھتے ہیں:

''پیراکی میں یہ کمال کم لوگوں کو نصیب ہوا ہوگا کہ جب ملاحی کے ہاتھ لگائیں تو پورا سینہ کوڑی کے مقام تک بالائے آب رہے۔''

جسمانی تناسب اور قوت

آپ کا جسم مبارک بہت ہی متناسب وموزون اور خوبصورت تھا۔ سینہ چکلا اور کمر پتلی، بازو بھرے ہوئے اور کلائیوں وغیرہ کی ہڈی چوڑی اور رگ پٹھے کس دار تھے۔

ابتدائی قوت وطاقت کا اندازہ خود ممدوح کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''دل بے حد کمزور ہو چکا ہے فکروں اور مصائب نے ضعیف کر دیا ہے۔ جن ہاتھ پیروں کی قوت پر مجھ کو ایک حد تک ناز تھا ان کی کمزوری اس حد تک پہنچ گئی جو کسی

دوسرے کے باور کرنے کے قابل نہیں۔''

(ماخوذ از رسالہ ''الوداع اے زینت محراب و منبر الوداع'')

پہلی نماز جماعت

مرزا کوکب قدر صاحب لکھتے ہیں:

''پہلی نماز جماعت سرکار مرحوم نے کہاں اور کس کی اجازت سے پڑھائی؟ کب؟ کا علم اس لئے نہ ہوسکا کہ سرکار کی قلمی بیاض میں تاریخ درج نہیں۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ اناؤ کے چودھری محمد ماہ صاحب کے گھر کے سامنے ایک قدیم مسجد ہے۔ علامہ ہبۃ الدین شہرستانی (کاظمین) اپنے قیام ہند کے زمانہ میں یہاں نماز پڑھانے والے تھے لیکن کچھ ناسازی مزاج کی وجہ سے انھوں نے سرکار مرحوم سے خواہش کی۔ انھوں نے عذر کیا کہ والد نے اب تک مجھے اجازت نہیں دی ہے۔ علامۂ موصوف نے فرمایا میں حکم دیتا ہوں۔ چنانچہ سرکار مرحوم نے نماز پڑھائی۔''

امامت جمعہ اور جانشینی

سرکار عماد العلماء جناب میر آغا صاحب قبلہ کے وقت سے امامت جمعہ وعیدین مسجد آصفی (لکھنؤ) میں اس خانوادہ کے اندر جاری ہے۔

جناب عماد العلماء کے بعد ان کے جانشین جناب قدوۃ العلماء طاب ثراہ ہوئے۔ جناب قدوۃ العلماء نے اپنی زندگی کے آخری دور میں خود اپنے فرزند جناب عمدۃ العلماء کو اپنا جانشین بنایا۔ اس کے متعلق ایک وصیت نامہ تحریر فرمایا جس پر اس وقت کے تمام ممتاز علمائے لکھنؤ کے دستخط کرائے۔ نیز اس وقت کے لفٹننٹ گورنر سے اپنی زندگی میں اس کے متعلق منظوری حاصل فرمائی کہ ممدوح کے بعد ان کے فرزند جناب عمدۃ العلماء امام جمعہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ ۱۳۴۴ھ میں خود عتبات عالیات کی طرف بارادۂ ہجرت روانہ ہوگئے اور اس طرح کافی عرصہ تک عملی حیثیت سے جناب عمدۃ العلماء ان کی جگہ امامت جمعہ فرماتے رہے۔

جناب قدوۃ العلماء نے کچھ عرصہ کے بعد عتبات عالیات سے اور نیز فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد مراجعت فرمائی مگر پھر زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ آپ نے ۱۳۴۸ھ میں سفر آخرت اختیار فرمایا لیکن آپ جناب عمدۃ العلماء کے موقف کو اپنی جانشینی میں مستحکم فرما چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب قدوۃ العلماء کے انتقال کے دوسرے ہی دن ۸ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۳ ستمبر ۱۹۲۹ء کو جمعہ تھا اور آپ نے نماز جمعہ پڑھائی تو اس کے بعد بعض حضرات کی شدید مخالفت کے باوجود آپ کی جانشینی اور امامت جمعہ بغیر تزلزل قائم وبرقرار رہی۔

آپ نے اس فرض منصبی کو بڑی پابندی کے ساتھ انجام دیا۔ اگرچہ بسلسلۂ ذاکری آپ اکثر دور دور تشریف لے جاتے تھے لیکن ہمیشہ جمعہ کے دن لکھنؤ پہنچ جاتے تھے اور کبھی جمعہ کو ناغہ نہیں ہونے دیا۔ بے شک جب آپ کے فرزند رشید جناب صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ مدظلہ بحمد اللہ اس درجہ پر پہنچ گئے کہ آپ کی اقتدا میں نماز جمعہ ہو تو اب حضرت عمدۃ العلماء کو اطمینان ہوگیا تھا اور اب حیدرآباد یا بمبئی کے ایسے وعدے بھی فرمالیا کرتے تھے جن سے جمعہ میں نہ پہنچ سکیں۔ چنانچہ اب برابر صفوۃ العلماء مدظلہ

سرکار مرحوم کی غیبت میں نماز جمعہ پڑھاتے رہے اور جب جناب مرحوم ۱۹۵۳ء میں عراق بغرض زیارات تشریف لے گئے تو کئی مہینے مسلسل آپ نے جمعہ پڑھایا اور اب جناب مرحوم کی علالت میں ۲۹ / مارچ ۱۹۶۳ء کے بعد سے جناب مرحوم کی اقتداء میں آخری نماز جمعہ ہوئی اور اس کے بعد مرحوم شدت علالت کی وجہ سے تشریف نہ لے جا سکے۔ آپ ہی اپنے والد بزرگوار کی جانشینی میں اس فریضہ کو انجام دیتے رہے اور آپ کے بعد سے برابر انجام دے رہے ہیں۔

قومی خدمات

جناب عمدۃ العلماء کے پیش رو حضرت قدوۃ العلماء طاب ثراہ تھے جو قومی زندگی کے بہت بڑے معمار تھے جن کی نشانی آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور آل انڈیا شیعہ یتیم خانہ کی شکل میں اب تک موجود ہے۔

جب جناب عمدۃ العلماء نے آنکھ کھولی تو قومی سرگرمیاں معراج شباب پر تھیں چنانچہ آپ بھی اپنے والد ماجد کے حکم سے ان سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔

سب سے پہلے مطبع عماد الاسلام کی مینیجری کا کام آپ کے سپرد ہوا۔ اس مطبع سے جناب غفران مآبؒ کی کتاب عماد الاسلام کی تین جلدیں توحید، عدل اور نبوت معرض طباعت میں آئیں نیز عماد الاسلام کتاب التوحید کے مقدمات کا ترجمہ خود جناب قدوۃ العلماء کے قلم سے شائع ہوا۔ ایک ماہانہ رسالہ بھی اس مطبع سے نکلتا تھا جس کا نام ''معالم'' تھا۔ اس سب کے علاوہ جناب قدوۃ العلماء اپنے پیش رو حضرت عماد العلماء میر آغا صاحب قبلہ کی زندگی ہی میں قومی تحریکات کے لئے انجمن صدر الصدور قیام فرما چکے تھے۔ جب ۱۹۰۷ء میں اسی انجمن کا نام شیعہ کانفرنس ہوا اور اس کا جلسہ لکھنؤ میں ہوا تو اس کے انتظامات کے لئے نوجوانان خاندان پر مشتمل ایک رضا کاروں کی جمعیت ''انجمن نقویہ'' قائم ہوئی اور جناب عمدۃ العلماء جو ابھی کم عمر ہی تھے انجمن نقویہ کے ممبر کی حیثیت سے آبدار خانہ اور دار الطعام وغیرہ کے انتظامات میں شریک ہوئے۔ پھر شیعہ کانفرنس کی مرکزی کمیٹی کے ممبر ہوئے۔ یہاں تک کہ کانفرنس میں تعمیم و تخصیص کا جھگڑا پیدا ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائے زمانہ کانفرنس میں یہ قید رکھی گئی تھی کہ صدر طبقۂ مجتہدین میں سے کوئی فرد ہوگی۔ یہ پابندی تعلیم یافتہ طبقہ کو بار خاطر ہوئی اور اس کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ اس ذیل میں کانفرنس کے اندر دو الگ الگ گروپ ہو گئے ایک ان حضرات علماء کے متبعین کا اور دوسرا آزاد خیال تعلیم یافتہ گروہ کا۔

اس ذیل میں کانفرنس کے کھلے ہوئے اجلاس میں جناب سر سید وزیر حسین مرحوم اور خطیب آل محمدؐ مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ کے باہمی مباحثہ کی تقریریں تاریخی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان مباحثوں میں اگرچہ نتیجتاً علماء کا پلّہ بھاری رہتا تھا اور تعلیم یافتہ گروہ پوری کوشش کے باوجود تخصیص کو تعمیم سے نہیں بدل سکا مگر یہ روز روز کی کشمکش اور پھر جلسے کے کھلے ہوئے مباحثہ میں مخالفت، مقررین کی تقریروں میں علماء کی قیادت پر نکتہ چینی کا ہونا ان حضرات کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ چنانچہ دوسرے علماء

کے پہلے خود بانیٔ کانفرنس جناب قدوۃ العلماء نے کانفرنس سے علٰحدگی اختیار کی۔ پھر جناب ناصر الملۃ اور جناب نجم الملۃ یکے بعد دیگرے علٰحدہ ہوئے۔

اگر چہ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات علماء نے عالی ظرفی کی بنا پر علاحدگی کے بعد کانفرنس کے خلاف کوئی مہم شروع نہیں کی۔ نہ اس کی تبلیغ کی کہ دوسرے کانفرنس میں شریک نہ ہوں مگر صرف ان حضرات کی علاحدگی ہی سے قوم میں کانفرنس کے خلاف شدید فضا پیدا ہوگئی۔ یہ قوم کے اندر بڑا بحرانی دور تھا۔ ان حالات میں عمدۃ العلماء بھی کانفرنس کی مرکزی کمیٹی سے مستعفی ہوئے۔ اس کے بعد جناب قدوۃ العلماء نے ہفتہ وار اخبار ''الناطق'' کا اجراء فرمایا جس کی ادارت جناب عمدۃ العلماء فرماتے تھے۔ یہ اخبار دو تین سال جاری رہا۔ اس کے علاوہ حضرت قدوۃ العلماء نے اب ادارہ ''شیعہ بیت المال'' کی بنا ڈالی جس کے تحت میں حسینیۂ جھاؤلال محلہ ٹھاکر گنج لکھنؤ کے سامنے والی مسجد میں جو جناب نواب سجاد علی خان عرف منّے نواب صاحب رئیس کی زیر تولیت تھی ایک مدرسہ کی بنا ڈالی گئی جس کا مدرس اعلیٰ جناب قدوۃ العلماء نے پہلے جناب ممتاز العلماء مولانا سید ابوالحسن صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہٗ کو مقرر فرمایا تھا۔ باقی مدرسین جن کے نام ہمیں معلوم ہیں حسب ذیل ہیں:

۱۔　جناب قاری سید حسین صاحب مرحوم

۲۔　جناب مولانا سید زاہد حسن صاحب مرحوم (آل غفران مآبؒ)

۳۔　جناب مولانا سید محمد مہدی عرف سید صاحب مرحوم۔

۴۔　جناب مولانا سید عنایت حسین صاحب مرحوم (آل غفران مآبؒ)

جب مدرسۃ الواعظین قائم ہوا اور سرکار نجم الملۃ اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے جناب ممتاز العلماء کے خدمات بحیثیت وائس پرنسپل مدرسۃ الواعظین میں حاصل فرما لئے تو بیت المال کے مدرس اعلیٰ کی حیثیت سے جناب عمدۃ العلماء کا تقرر کیا گیا اور آپ فرائض تدریس انجام دیتے رہے۔

جناب قدوۃ العلماء طاب ثراہ کے بعد اگر چہ یہ مدرسہ اور بیت المال کے اکثر شعبے ٹوٹ گئے مگر جناب عمدۃ العلماء اس کے اکثر مقاصد کی تکمیل میں کسی نہ کسی طرح مصروف رہے چنانچہ انھیں مقاصد میں ایک اقتصادیات کا شعبہ تھا جس کے ماتحت جناب قدوۃ العلماء نے غلّہ وغیرہ کی دکانیں کھلوائیں اور بتاسئ معصومینؑ ممدوح کی مثالی سادگی کا یہ نمونہ لوگوں نے دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ میں کافی وزنی گٹھری جنس کی لئے ہوئے راستہ چل رہے ہیں۔ ایک دوکان پر جو، جوہری محلہ کے نکڑ پر سڑک کے کنارے تھی مولانا سید علی رضا صاحب (ابن مولانا سید محمد سخا عرف متّن صاحب ابن خلاصۃ العلماء ابن سلطان العلماء) بیٹھا کرتے تھے۔ یہ دوکان عرصہ تک قائم رہی۔ پھر انقلاب زمانہ سے ٹوٹ گئی۔ جناب عمدۃ العلماء نے کلکتہ کے اجلاس شیعہ کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اس دور کی اقتصادی سرگرمیوں کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے:

''میرے والد مرحوم نے اکثر اپنے اعزاء کو غلہ اور کپڑے کے دوکانیں کھلوا دیں اور خود ان دوکانوں پر

جا کر بیٹھے اور بعض دن میں خود اور بعض دیگر حضرات ٹھیلا لے کر شہر میں نکلے اور معمولی چیزیں جیسے سگریٹ، بیڑی، بسکٹ وغیرہ فروخت کئے۔''

اس کے بعد اب جناب عمدۃ العلماء نے اسی مقصد کے ماتحت ۱۴؍دسمبر ۱۹۴۱ء کو ادارۂ اقتصادیات شیعہ قائم فرمایا جس کے سکریٹری فعلاً جناب مرزا رضا حسین صاحب ہیں۔ خدا کرے یہ ادارہ اس بلندی تک پہنچ جائے جو اس کے بانی جناب عمدۃ العلماء کے پیش نظر تھی۔

چند سال اُس طرف جناب مرحوم نے اخبار ہفت روزہ ''سحاب'' بھی جاری فرمایا تھا جس کی ادارت جناب سید الواعظین خطیب اکبر مولانا سید اولاد حسین صاحب شاعرؔ مرحوم کے سپرد فرمائی تھی۔ یہ اخبار کچھ عرصہ تک جاری رہ کے بند ہو گیا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اگرچہ ان علماء نے جو بانیان کانفرنس تھے شیعہ کانفرنس سے علٰحدگی کے بعد کوئی محاذ اس کے خلاف قائم نہیں کیا تھا۔ پھر بھی بہت سے افراد شیعہ کانفرنس کی شرکت اور اس کے کاموں میں امداد سے کچھ واقعی علماء کی علٰحدگی سے بددلی کی بنا پر اور کچھ اپنی بے عملی کا ایک بہانہ قرار دے کر پہلوتہی کرتے تھے اس لئے جناب عمدۃ العلماء نے بربنائے مفاد قومی اس خلیج کو پاٹنے کی ضرورت محسوس فرماتے ہوئے ۱۹۵۶ء میں شیعہ کانفرنس کے اجلاس میرٹھ کی اور پھر دوبارہ کلکتہ کے اجلاس کی صدارت منظور فرمائی۔ اور میرٹھ کے اجلاس میں خطبۂ صدارت کے آغاز میں اپنا تعلقِ خاص شیعہ کانفرنس کے ساتھ اس طرح ظاہر فرمایا:

''اس کانفرنس نے اور میں نے ایک ہی آغوش میں پرورش پائی۔ منزل تربیت ایک ہی تھی۔''

اصلاحی رجحان

جناب عمدۃ العلماء اکثر اپنے بیانات میں قومی امراض کی نشان دہی فرماتے تھے اور کبھی کھل کر عوام کے غلط رجحانات کی مخالفت فرماتے تھے اور اس کے لئے کبھی کبھی ایک طبقہ کی برہمی کا مرکز بن جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے بڑی سختی کے ساتھ نوروز میں رنگ کھیلنے کی مخالفت فرمائی۔ اسی طرح اکثر ذاکرین کی اس تلقین کے خلاف کہ باعث نجات صرف رونا وُرلانا ہے جس سے عوام کو احساس ہوتا ہے کہ احکام شریعت کی پابندی کی کوئی ضرورت نہیں، آپ نے ایک مرتبہ اخبار میں ایک بڑا پُرزور مضمون تحریر فرمایا جس کی وجہ سے ''حامئ عقائد ومسلمات'' گروہ کے اہل منبر نے کچھ عرصہ تک منبروں سے آپ پر بھی طعن وتشنیع کا سلسلہ جاری رکھا۔

اس سلسلہ میں مرزا کوکب قدر صاحب نے ایک عبرت انگیز واقعہ تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سرکار مرحوم نے خود بستر مرگ پر ایک واقعہ بیان کیا جس سے انتہا پسند شیعوں کے حالات کا علم ہوتا ہے۔ جنوبی ہند میں سرکار مرحوم کو مجلس پڑھنے کے لئے طلب کیا گیا ایک صاحب ملنے آئے تو یہ خیال کرتے ہوئے کہ سرکار مرحوم زندگی بھر حسینؑ کی خدمت کرتے رہے ہیں اپنے عقیدے کو نہایت کھل کر بیان کیا کہ ''شیعوں کی تو تخلیق ہی

رونے کے لئے ہوئی ہے۔ نماز روزے اور دیگر احکام کی پابندی ان پر لازم نہیں۔'' سرکار مرحوم نے صاف کہہ دیا کہ آپ بے دین ہیں۔ وہ حضرت بانیان مجلس کے پاس شکایت لے گئے کہ صاحب میں نے تو سنا تھا کہ آپ نے ذاکر بلایا ہے یہ تو مولوی ہیں۔ حسینؑ پر رونے والوں کو بے دین بتاتے ہیں، یہ مجلس کیا پڑھیں گے۔''

صلابت دینی اور حرارت قومی

دینی خدمات کے ذیل میں جناب کوکب قدر صاحب نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے جس کی تصویر کشی انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے کہ

''ایک نوجوان ہے جو مجاہدانہ علم ہاتھ میں لئے پچاس ہزار کے مجمع سے کوتوالی پولیس چوک کی طرف بڑھتا نظر آتا ہے۔''

اس جلوس کی صحیح صورت حال جو پیام اسلام یکم ستمبر ۱۹۶۴ء کے پرچہ میں شائع کی جاچکی ہے یہ ہے کہ جنت البقیع کے انہدام کے بعد وہابی طبقہ کو چھوڑ کر تمام عالم اسلام میں تہلکہ مچ گیا اور ہندوستان، بالخصوص لکھنؤ میں مشترک مسلمانوں کے اور خاص طور پر شیعوں کے کثیر التعداد مظاہرات ہوئے چنانچہ سالانہ دو یوم غم مستقل طور پر قائم ہوئے۔ ایک تمام علماء کا قائم کیا ہوا خاص ۸ رشوال کو جو روز انہدام جنت البقیع ہے اور دوسرا خاص جناب قدوۃ العلماءؒ کا قائم کیا ہوا شیعہ بیت المال میں جو صفر کے پہلے اتوار میں ہوا کیا۔ ان تمام مظاہرات میں کبھی انگریز حکومت کی طرف سے کوئی مزاحمت یا مداخلت نہیں ہوئی مگر اس کے کئی سال کے بعد حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک آرڈیننس جاری ہوا کہ جس طرح حکومت برطانیہ کو برا کہنا داخل بغاوت ہے اسی طرح حکومت برطانیہ کے کسی حلیف کو برا کہنا بھی بغاوت میں داخل سمجھا جائے گا۔ اس پر علماء وزعمائے شیعہ نے خطرہ محسوس کیا کہ چونکہ ابن سعود بھی حکومت برطانیہ کے حلیفوں میں سے ہے لہٰذا اس کے تحت میں ابن سعود کو برا کہنا بھی ممنوع قرار دیا جارہا ہے اور چونکہ ابن سعود کو برا کہنا اس وقت مذہبی بنیاد پر فرقہ شیعہ کا ایک شعار تھا لہٰذا اس کو شیعوں کے مذہبی حقوق میں مداخلت قرار دے کر ایک احتجاجی جلوس نکالا گیا۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ لکھنؤ کی تاریخ میں اتنا بڑا احتجاجی جلوس کبھی نہیں نکلا ہے۔ اس میں خاص احتجاجی نعرے یہ تھے کہ:

''ابن سعود برباد، اس کے ساتھی ناشاد۔ چراغ دین محمدؐ روشن باد۔''

اس جلوس میں طبقۂ علماء میں سے دو شخص آگے آگے تھے۔ ایک نسبۃً مسن سرکار ممتاز العلماء مولانا سید ابوالحسن عرف منّن صاحب قبلہ جو چچا تھے اور دوسرے نوجوان بھتیجے جناب عمدۃ العلماء۔ چنانچہ اس کے بعد کئی دن یہ خبر گرم رہی کہ یہ دونوں بزرگوار گرفتار کرلئے جائیں گے مگر حکومت برطانیہ نے شیعوں کے مذہبی جوش کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور یہ اعلان کردیا کہ اس آرڈیننس کا تعلق اُن مظاہرات سے نہیں ہے جو کسی مذہبی بنیاد پر کئے جائیں۔

غالباً یہ پہلا موقع تھا جب جناب عمدۃ العلماء

ایک ایسے میدان میں نمایاں طور پر نظر آئے۔

اس کے بعد پھر جب کوئی ایسا موقع پیش آیا تو برابر وہ سامنے نظر آتے رہے چنانچہ جناب مرزا حیدر حسین صاحب حیدر مدیر ''پیام اسلام'' نے یکم فروری ۱۹۶۴ء کے شمارہ میں ''سرکار عمدۃ العلماء اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے سیر و آثار کے چند نمایاں پہلو'' کے زیر عنوان جو مقالہ خود اپنے قلم سے درج کیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

''مرحوم مذہبی و ملی امور کی حمایت کے لئے بڑی دلیری اور جرات کے ساتھ میدان میں اُتر آئے تھے۔ جنۃ البقیع و قبۃ المعلّیٰ کے مسئلہ پر جو مرکزی اجتماع الہ آباد میں ۴/اپریل ۱۹۵۴ء کو ہوا تھا اس کے بھی مرحوم ہی صدر تھے۔ شاہ سعود کے ورود نے شیعیان ہند کی جراحت قدیم کو تازہ کر دیا تھا چنانچہ ان کی آمد کے موقع پر ۴/دسمبر ۱۹۵۵ء کو جو احتجاجی جلسہ حسینیۂ غفران مآبؒ میں ہوا تھا اس کا سہرا بھی مرحوم ہی کے سر تھا۔

اگست ۱۹۵۱ء کے لکھنؤ کے اجلاس آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے موقع پر مولانا ہی کی یہ ہمت اور اخلاقی جرأت تھی کہ اکیلے سیاسیات کو سوشل کانفرنس سے علٰحدہ رکھنے پر اڑے رہے اور جب تک سیاسی مسائل پیش ہوتے رہے پنڈال کے باہر ہی رہے اور اندر قدم نہیں رکھا۔

۱۹۳۹ء میں جب قوم شیعہ بڑے ابتلاء سے گذر رہی تھی تو جناب مرحوم بھی اس جہاد میں برابر پیش پیش رہے تھے اور ہر منزل پر قوم کی قیادت فرماتے ہوئے جیل بھی تشریف لے گئے تھے۔ چونکہ آپ کو نماز جمعہ کا انتہائی خیال رہتا تھا اس لئے اس موقع پر اپنی عدم موجودگی میں نماز جمعہ پڑھانے کے لئے اپنے بزرگ خاندان آیۃ اللہ فی الانام اعلم العلماء مولانا سید سبط حسین صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہٗ کو جونپور سے مخصوص طور سے زحمت سفر دی تھی چنانچہ سرکار مرحوم نے تشریف لا کر نماز جمعہ پڑھانے کے بعد نماز عصر کی امامت کے لئے جناب مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ کو آگے بڑھا دیا تھا اور آئندہ کے لئے ہدایت فرما دی تھی کہ اب تم ہی نماز جمعہ وغیرہ کی امامت کرتے رہنا۔

جناب مرحوم کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ امام باڑہ غفران مآب طاب ثراہ کی مرمت ہے۔ یوں تو متعدد بار مرمت کی جا چکی تھی مگر اس مرتبہ ایسی مرمت کرائی کہ اس کو اگر تعمیر جدید کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔''

اجلاس شیعہ کانفرنس ۱۹۵۱ھ کے متعلق جو اجمالی تذکرہ مدیر پیام اسلام نے فرمایا ہے اس کا ذکر اپنے انداز میں جناب رضی الدین حیدر صاحب ایم۔اے۔ بانیٔ یادگار حسینی کالج، الہ آباد نے بھی اپنے مضمون ''یادوں کے چراغ'' میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شیعہ کانفرنس کے اجلاس ہائے سالانہ، مرکزی کمیٹیوں اور شیعہ یتیم خانہ کے جلسوں میں مولانا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مولانا ان موقعوں پر صرف ایک فرد قوم کی حیثیت سے کارروائیوں میں حصہ لیتے تھے اور اپنی رائے پیش فرما کر کبھی اپنی شخصیت کے دباؤ سے منوانے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور اسی لئے یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ مولویانہ معصومیت کسی مسئلہ میں شدت یا نزاع کی حد تک

نہیں جاسکتی لیکن جب اعلیٰ حضرت نواب صاحب رام پور کی صدارت میں ہونے والے تاریخی اجلاس لکھنؤ میں جہاں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے لوگ کھنچ آئے تھے مرحوم کسی نزاعی مسئلہ پر اصولی اختلاف کی بناء پر واک آؤٹ کر گئے تب اس وقت معلوم ہوا کہ اس دبلے پتلے انسان کے خشک پیکر میں حق پسندی اور خودداری کی وہ چنگاری بھی چھپی ہوئی ہے جو وقت آنے پر ایک شعلۂ جوّالہ بن کر بھڑک اٹھے۔

انداز خطابت اور خصوصیات ذاکری

جس طرح حسین صورت کے سلسلہ میں شاعر نے کہا ہے:

خوبی فقط کرشمہ و ناز و خرام نیست
صد شیوہ است بہر حسیناں کہ نام نیست

وہی صورت ''حسنِ خطابت'' کی ہے چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جناب عمدۃ العلماء کے انداز خطابت کی مقبولیت کا مرکزی نقطہ کیا تھا اسے الفاظ میں بیان کرنا بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کچھ بہت گہرے مضامین بیان فرماتے تھے جن میں منطق و فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا تھا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کے یہاں الفاظ و عبارات میں کوئی ایسی آرائش ہوتی تھی جو دلفریب ہو۔ نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے جملوں میں بڑا زور وشور اور انداز بیان میں جوش وخروش تھا۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ آپ تلاش سے کچھ ایسے معلومات پیش فرماتے تھے جن سے آپ کی وسعتِ نظر اور تبحّر علمی کا اندازہ ہو یا آپ کے کلام میں ظرافت ہوتی تھی یا مناظرانہ ضربیں فریق مخالف پر ہوتی تھیں۔ جی نہیں! یہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کا بیان بہت خوب ہوتا تھا اور وہ خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ اور مولانا حکیم مقبول احمد صاحب وغیرہ ایسے بے مثال خطیبوں ہی کے دور میں مقبول ہونا شروع ہوگیا اور اس کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا گیا

پھر بھی یہ سوال جواب طلب ہی رہتا ہے کہ وہ خوبی کیا تھی اور چونکہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا کوئی نام ہو اس لئے تبصرہ نگاروں کے بیانات اس سلسلہ میں مختلف محوروں پر گردش کرتے ہیں۔

محترم مدیر سرفراز لکھنؤ ان خصوصیات کو اس طرح بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ:

''آپ کی زبان کوثر و سلسبیل سے دھلی ہوئی تھی۔ آپ کی آواز نہایت موزوں، مناسب اور متوازن تھی۔ ہزاروں کے مجمع میں جب تقریر فرماتے تھے تو خواہ کسی بات کو کتنا ہی زور دے کر جوش میں بیان کریں آواز تھراتی نہ تھی۔ مجلس میں کتنا ہی شور گریہ ہو آپ کی آواز اس پر بھی بلند رہتی تھی۔ تقریر میں بے پناہ روانی وسلاست تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ زبان سے جو فقرے نکل رہے ہیں وہ سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ہر لفظ ایک نگینہ معلوم ہوتا تھا۔ مجلس میں فضائل پڑھ رہے ہوں یا مصائب، کوئی ادا ایسی نہ ہوتی جو سنجیدگی کے خلاف ہو۔ نہ کبھی جوش میں منبر پر کھڑے ہوتے تھے۔ نہ کبھی سینہ اور زانو پر ہاتھ مارتے تھے بلکہ انتہائی سکون ووقار کے ساتھ تقریر جاری رہتی تھی۔ آپ کی آواز نہ

کبھی تحسین وآفرین کے سر بفلک نعروں میں ڈوب جاتی تھی اور نہ گریہ وزاری کے شور میں بلکہ ہر حالت میں وہ غالب ہی رہتی تھی۔''

پرنس کوکب قدر سجاد علی مرزا صاحب ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی۔رقم طراز ہیں کہ:

''سرکار مرحوم کی تقریر ان کے تعارف کا بہترین ذریعہ تھی۔آواز کی انفرادیت، الفاظ کی نشست، جملوں کا بناؤ، فقروں کا ٹھہراؤ۔ممکن نہیں کہ وہ پُرکشش آواز سنائی دے اور انسان سننے پر مجبور نہ ہوجائے۔''

پھر موصوف ہی نے خاندان ناصری کے پاکستانی چشم وچراغ جناب ضیاء الحسن صاحب موسوی عبقاتی کے قلم کا جو اقتباس جریدۂ ارشاد کراچی سے نقل کیا ہے اس میں ہے کہ:

''خطابت کا وہ باب جو''مولوی کبّن صاحب'' سے شروع ہوا اور ان ہی پر ختم ہوگیا۔وہ باب جو اپنی نوعیت کا انوکھا باب تھا۔لکھنؤ کی زبان، سلیس اور سادہ زبان جس کی سجاوٹ یہی تھی کہ اس میں کوئی سجاوٹ کی کوشش شامل نہ ہوتی۔جس کی روانی کا یہ عالم تھا کہ اس سے زیادہ رواں زبان عام گفتگو میں بھی نہیں بولی جاتی تھی۔اس زبان میں فضائل ومصائب محمدؐ وآل محمدؐ، مطالب تفسیر وحدیث، نکات معقولات ومنقولات کو جس طرح مولانا بیان کرتے تھے وہ انھی کا ایجاد کردہ طور تھا اور انھی پر ختم ہوگیا۔تقریباً نصف صدی انھوں نے اسی رنگ میں ذاکری فرمائی مگر کوئی اس سادگی کی نقل بھی نہ کرسکا۔''

جناب رضی الدین حیدر صاحب ایم۔اے۔ نے''یادوں کا چراغ''میں تحریر فرمایا ہے:

''۱۹۳۰ء میں سرکار عمدۃ العلماء امام باڑہ عرب علی خان مرحوم واقع محلہ دریا آباد، الہ آباد کے عشرۂ اربعین میں تشریف لائے تھے۔وہ زمانہ عمدۃ العلماء کی بھی جوانی کا تھا۔ بیان اور حسن پر بھی شباب کی رعنائی چھائی تھی۔ان بیانات کا کوئی گوشہ آج میرے حافظہ میں محفوظ نہیں رہا مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ انداز بیان اور آواز تقریر بعینہ ویسی ہی تھی جیسی کہ آخر عمر تک رہی۔مولانا کے لہجہ کی یہ انفرادیت باوجود اثر انگیز اور رقت خیز ہونے کے بڑی پرسکون اور باوقار تھی۔''

سب سے زیادہ بسیط تبصرہ ان کے انداز ذاکری پر کرنے کی کوشش نمونے تک پیش کرنے کے ساتھ مرزا سجاد حسین صاحب بی کام (لکھنؤ) نے کی ہے۔چنانچہ''عمدۃ العلماء کی صلاحیت خطابت وقوت تقریر''کے عنوان سے ان کا مضمون سرفراز ۲؍نومبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔اس میں وہ لکھتے ہیں:

''ایک بات کو متعدد جملوں میں کہنا اور اس انداز سے کہ ہر جملہ اپنے میں کچھ انفرادیت بھی رکھتا ہو۔نیز اس پر طول کلام کا اطلاق بھی نہ ہو، موصوف ہی کی خصوصیت تھی۔ تشبیہات واستعارات کا استعمال ان سے بہتر کہیں اور نہیں ملتا۔چند جملے نمونے کے طور پر پیش کروں گا جو جناب فاطمہ بنت اسد کے بعد ولادت امیرالمومنینؑ کعبہ کے باہر آنے کے سلسلہ میں بیان فرمائے تھے:

''بہر حال تین دن کے بعد بچہ کو آغوش محبت

میں لئے آیت الٰہی کو سینہ سے لگائے، نور بصر کو دامن میں چھپائے ہوئے مادر گرامی کعبہ سے نکلیں۔ پھر کعبہ کی دیوار ہٹی یا باب کعبہ سحاب کی طرح آفتاب کے سامنے سے سرکا، یا دریا نے شق ہو کر کلیم خدا کو راستا دیا یا فلک کے دروازے معراج حبیبؐ میں کشادہ ہوئے اور آغوش مادر میں مسکراتا ہوا بچہ شوق دیدارِ رسولؐ میں آنکھیں بند کئے ہوئے قبلۂ اسلام سے باہر آیا۔ ابر ہٹا، چاند نکلا یا گلاب کے پھول سے خوشبو نکلی یا چاہ کنعان سے یوسف نکلے یا رات کی تاریکی میں نور سحر چمکا یا شاخ میں پھول کھلا یا دل کعبہ کی آرزو نکلی۔''

کون ہے جو ان جملوں کے سننے کے بعد وجد میں جھومنے نہ لگے۔ روانی وسلاست کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

قرآن کریم کی مدح کرتے ہوئے ایک جگہ یوں رطب اللسان ہوئے:

''آپ ہی فرمایئے کہ وہ مصنف کیسا تھا جس نے قرآن سی کتاب یوں تصنیف کردی کہ اس میں ہر علم موجود، ہر صنف موجود، ہر نوع موجود، ہر جز وحکمت موجود، گذشتہ، آئندہ، حاضر، غائب، گزرنے والا، آنے والا، فطرت انسانی، فطرت حیوانی، طبیعت جمادی، طبیعت بناتی۔ مختصر یہ کہ دنیا کی ہر چیز موجود۔ پھر غلطی نہیں، لغزش نہیں، شبہ نہیں، دھوکا نہیں، اس کی فصاحت کی نظیر نہیں، اس کی بلاغت کا جواب نہیں، بدیع کا بانی تمام اصناف کلام کا جامع، کچھ ظاہر میں، کچھ باطن میں، کچھ تفسیر میں، کچھ تاویل میں، کچھ جاہلوں کے لئے، کچھ عالموں کے لئے۔''

وہ جس اطمینان سے مجلس پڑھتے تھے وہ اطمینان دمِ تقریر ہم نے کسی کے یہاں نہ دیکھا۔ چہرہ پر حد درجہ بشاشت وشگفتگی رہتی تھی اور وہ اپنے کسی انداز سے زبردستی اپنی قابلیت وصلاحیت کا لوہا منوانا نہیں چاہتے تھے۔''

اس سب سے کچھ تصور آپ کو ان کے محاسنِ بیان کا ہو جائے تو وہ اس لئے ہوگا کہ آپ نے خود انھیں کبھی سن لیا ہے۔ اس لئے آپ کے ذہن میں بھی کچھ اسی طرح کے تصورات ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب عبارات اس چیز کو ظاہر نہیں کرتے جو واقعاً ان کے بیان میں تھی اور جس کا حقیقت میں کوئی ''نام'' نہیں ہے جسے مقامِ تعبیر میں کہا جائے۔

کچھ خاص بیانات

یوں تو جناب عمدۃ العلماء نے ہندوستان وپاکستان میں بکثرت کامیاب تقریریں فرمائیں مگر چند بیان ان کے خصوصیت کے ساتھ یادگار رہوئے۔

ایک سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ کے بین الاقوامی اجلاس لکھنؤ میں جو قیصر باغ کی بارہ دری میں ہوا تھا ''حسین اور انسانیت'' کے موضوع پر معرکہ آرا تقریر جس میں ہر مذہب وملت کے افراد وجد کر رہے تھے۔ یہ تقریر حسین ڈے لکھنؤ کی رپورٹ (مرتبہ مرزا جعفر حسین صاحب ایڈوکیٹ) میں شائع ہوئی ہے۔

اس تقریر کا ذکر جناب رضی الدین حیدر صاحب ایم۔اے۔ نے بھی ''یادوں کے چراغ'' میں کیا ہے کہ:

''سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی لکھنؤ کے اجلاس کی

وہ تاریخی تقریر بھی یادگار حیثیت رکھتی ہے جو مطبوعہ رپورٹ میں شامل ہے۔ خطبہ کا ایک ایک لفظ مفکرانہ اور مجتہدانہ انداز میں پیش ہوا ہے اور ہر مضمون و مطلب عقل وایقان کی خالص وجدانی آواز معلوم ہوتا ہے۔''

دوسری ایک محفل کا ذکر کوکب قدر صاحب نے اس طرح کیا ہے:

۱۹۵۸ء میں بنارس میں ترقی پسند شعراء کی ٹولی سے سابقہ پڑا۔ شعرائے کرام اپنے پُرجوش قصیدوں سے محفل کو زیروزبر کر چکے تھے۔ جناب کا منبر پر تشریف لے جانا بے سود نظر آتا تھا لیکن جب ''قرآن اور شاعری'' کے موضوع پر سرکار مرحوم کی زبان سے پھول جھڑنا شروع ہوئے ہیں تو سامعین پر وجد کا عالم طاری تھا۔ ایک سماں بندھ گیا اور لوگ نثر کے آگے اس نظم کو بھول گئے جس نے تھوڑی دیر پہلے سب کو بے حال کر دیا تھا۔''

تیسری غیر معمولی یادگار مجلس ایک سال کے ۹ رمحرم کی ہے جس کا تذکرہ کوکب قدر صاحب نے اس طرح کیا ہے کہ:

''مشہور ہے کہ خطیب اعظم جناب سبط حسن صاحب نے بارش میں ایسی مجلس پڑھی کہ سننے والے اپنی جگہ بیٹھے رہے اور بارش کی مطلق پرواہ نہ کی۔ کمال یہ بھی ہے لیکن اس سے بڑا نہیں جو ۹ رمحرم ۱۹۵۷ء کی مجلس حسینیہ غفرانمآبؒ میں سرکار مرحوم کی سحر کلامی سے مشاہدہ میں آیا۔ مجلس کی رات کو طوفانی بارش میں تمام نمگیرے گر پڑے تھے اور جب مجلس کا وقت آیا تو منبر کے چاروں طرف کیچڑ میں لت پت ان نمگیروں کے علاوہ کوئی بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ اس پر سے قیامت یہ کہ آفتاب نے بھی پوری آب وتاب سے چمکنا شروع کیا۔ سر پر تیز آفتاب، پیروں تلے کیچڑ اور اس پر اٹھتے ہوئے بخارات۔ کسی کا بیٹھنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ جب بہت اصرار کیا گیا تو نصف مجلس اکڑوں بیٹھ گئی اور اس عالم میں سر برہنہ جناب منبر پر تشریف لے گئے لیکن جب مجلس ختم ہوئی تو کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ ثقہ بزرگوں کا بیان ہے کہ جناب نے نویں کی ایسی کامیاب مجلس کبھی نہیں پڑھی۔''

پاکستان کی ایک تقریر کا ذکر جناب ضیاء الحسن صاحب موسوی عبقاتی نے ''ارشاد'' کراچی میں اس طرح کیا ہے کہ:

''نصف شب سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ جہانگیر پارک بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ کراچی کے ہزارہا مسلمان میلادِ سرورِ کائناتؐ کے جلسے میں مختلف علماء اور زعماء کی تقریریں سن رہے تھے۔ یکا یک ایک باوقار عالم عمامہ عبا قبا کے ساتھ مائکروفون کے سامنے آئے۔ عام شرکاء نے اس خیال سے کہ یہ بزرگوار بھی آیات واحادیث کی تلاوت فرمائیں گے اور نعت ومنقبت کی عام باتیں کریں گے، چائے پینے یا گھر جانے کے لئے کھسکنا شروع کیا مگر چند لمحے نہ گزرے تھے کہ سارے مجمع پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ کوئی کانوں میں شہد ٹپکا رہا ہے۔ کوثر سے دُھلی ہوئی زبان اور عظمت محبوب الٰہی کا بیان۔ جانے والے واپس آ گئے، بیٹھنے والے اسٹیج کی طرف کھسکنے لگے۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگ بے تاب ہو ہو کے واہ واہ کے نعرے بلند

کرنے لگے۔ پندرہ منٹ کی تقریر میں ایسا سماں بندھا کہ ہر شخص اس جادو بیانی سے مسحور ہوگیا اور اس کے بعد جو مشہور ومعروف سیاست دان، پارلیمانی خطیب اور مذہبی مقرر بزرگوار تقریر کرنے کھڑے ہوئے وہ ایسے بوکھلائے کہ کہنا کچھ چاہتے تھے اور کہتے کچھ اور تھے۔''

جناب سید کلب مصطفی جائسی صاحب (ایڈوکیٹ) نے جناب مرحوم کے کمال خطابت کے ثبوت میں مہاراجکمار امیر علی صاحب (اقبال منزل، لکھنؤ) کے یہاں کے ان مجالس کا تذکرہ کیا ہے جن میں مہاراج کمار ہر سال کسی نہ کسی انگریز مصنف کے درج کردہ مضامین کے نوٹ لکھ کر سرکار مرحوم کو دیتے تھے کہ وہ ان کی رد فرمائیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''آپ کا منطقیانہ مدلّل اور پاکیزہ بیان تو رہا ایک طرف آپ کے باکمال، عدیم المثال اور قابو یافتہ خطیب ہونے کی ایک بین دلیل اور اس کا حیرت خیز ثبوت تو یہ ہے کہ آپ کا ''لکچر'' سن کر سمجھ ہی میں نہ آسکتا تھا کہ وہ مجلس پر کیونکر ختم ہوگا چہ جائیکہ ایک کامیاب مجلس پر لیکن جب آپ نے بس ایک ہی فقرے سے ''لکچر'' کو مجلس اور صرف دو اور جملوں پر اس مجلس کو کامیاب مجلس بنا کر اپنا بیان ختم کیا تو آپ کا بیان ایک اعجاز خطابت بن کر سامنے آگیا۔''

شام غریباں کی مجلس آپ کی ذاکری کے سلسلہ میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے نام کے ساتھ اب ماتمی اعلانات میں ''ذاکر شام غریباں'' کی لفظ لقبِ خصوصی کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔

اس تقریر کی خاص خصوصیت یہ رہی کہ یہ تمام وکمال لکھ کر گورنمنٹ کے یہاں بھیجی جاتی تھی۔ اس کے بعد اسے تمام وکمال زبانی یاد کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد یہ جناب مرحوم کا کمال تھا کہ آپ منبر پر اُسے بعینہٖ ایسے انداز میں پیش فرماتے تھے کہ جیسے وہ فی البدیہ تقریر فرما رہے ہیں اور بغیر کسی پابندی کے مجلس پڑھ رہے ہیں۔ یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے اور کوئی آسان بات نہیں ہے۔

مجالس عشرہ حسینیۂ غفران مآبؒ

جناب غفران مآب مولانا سید دلدار علی طاب ثراہ نے ۱۲۰۰ھ سے لکھنؤ کو مرکز بنا کر تمام ہندوستان میں جس طرح شیعیت کی تبلیغ واشاعت کا کام انجام دیا اسی طرح عزاداری کی ترویج اور اس کی تاثیر وافادیت میں اضافہ کو اپنا نقطۂ نگاہ قرار دیا۔ اس کے لئے آپ نے ایک عزاخانہ اپنے وطن نصیرآباد میں بنوایا اور دوسرا عزاخانہ لکھنؤ میں جو محلہ پاٹا نالہ میں ۱۲۱۰ھ میں تعمیر ہوا جس سے ملحق بعد میں ایک مسجد کی تعمیر فرمائی جس کی تاریخ ملّا خطا شوستری نے نکالی۔

''مسجد خجستہ بنا''

۱ ۲ ۲ ۸

یہ عزاخانہ ''حسینیۂ غفران مآبؒ'' کے نام سے مشہور ہے۔

تعمیر امام باڑہ کے بعد دوسرے سال یعنی ۱۲۱۱ھ سے اس امام باڑے میں مجلسیں شروع ہوگئیں اور جب سے وہ سلسلہ بحمد اللہ اب تک قائم ہے۔

جیسا کہ سرفراز مورخہ ۲؍جولائی ۱۹۶۲ء میں مرزا

سجاد حسین صاحب اترولوی نے لکھا ہے: ''جناب غفران مآبؒ نے اس حسینیہ میں ایک ضریح، ایک منبر اور ضریح کا ایک کٹہرا اس دور کے کاریگروں سے بنوایا جو تبرکات میں آج بھی آثار قدیمہ کے طور پر حسینیہ میں موجود ہیں اور نگراں حضرات ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے ان تبرکات کی عمر ایک سو بہتر سال کی ہے۔'' اور یہاں مجالس بھی اتنے ہی قدیم ہیں۔

کچھ عرصہ قبل تک ذاکرین کا طبقہ علماء سے الگ تھا۔ علماء و مجتہدین ذاکری نہیں فرماتے تھے۔ مگر حسینیۂ غفران مآبؒ کی عاشور کی مجلس اس سے مستثنیٰ رہی۔ اس دن خود جناب غفران مآبؒ ذاکری فرماتے تھے۔ پھر آپ کے بعد آپ کے فرزند اکبر جناب سلطان العلماء طاب ثراہ بھی عصر عاشور کو خود منبر پر سر برہنہ تشریف لے جا کر تذکرۂ مصائب فرماتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حضرات کے چند جملے مجلس میں کہرام برپا کرنے کے لئے کافی ہوتے تھے۔

جناب سلطان العلماء کے بعد جناب ملک العلماء مغفرت مآب نے یہ سنت قائم رکھی۔ اس کے بعد ملاذ العلماء جناب مولانا سید ابوالحسن عرف بچھن صاحب قبلہ اس مجلس کو اپنے انتہائی مؤثر انداز میں پڑھتے رہے اور پھر ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۷ء تک جناب بحر العلوم مولانا سید محمد حسین عرف علّن صاحب قبلہ ذاکری فرماتے رہے جو ایک مجتہدانہ رنگ ذاکری کے بانی تھے اور جن کی بدولت وہ تفریق جو علماء اور ذاکرین کی تھی بہت حد تک ختم ہوگئی۔ پھر ۱۹۰۷ء تک جناب کہف العلماء مولانا سید ابن حسن صاحب قبلہ پڑھتے رہے۔ جناب کہف العلماء کے بغرض تکمیل علم عراق کی طرف روانہ ہونے کے بعد سے مجالس حسینیۂ غفران مآبؒ میں انحطاط شروع ہوا۔ بے شک اس کے بعد ایک سال یعنی ۱۸۹۸ء میں عاشور کی مجلس جناب قدوۃ العلماء طاب ثراہ نے پڑھی۔ اس کے بعد وہ روایت کہ خاندان جناب غفران مآب کے ایک بزرگ عالم اس تاریخ ذاکری فرمائیں، ختم ہوگئی۔ پھر بھی اس خصوصیت کے قائم رکھنے کے لئے کہ اس تاریخ کی مجلس کوئی فقیہ پڑھے۔ ۱۹۱۱ء تک عاشور کی مجلس میں جناب تاج العلماء طاب ثراہ کے شاگرد باختصاص جناب مولانا سید ابوالحسن صاحب رضوی مجتہد مرحوم (ساکن مقبرۂ جناب عالیہ گولہ گنج) ذاکری فرماتے تھے اور باقی مجلسوں میں مختلف ذاکرین ذاکری کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ مجلسیں کسی معقول ذاکر کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت حد تک ٹوٹ گئیں۔ اس وقت شہر میں بس ایک مجلس سب سے بڑی ہوتی تھی اور وہ جناب جنت مآب سید تقی صاحب قبلہ کے امام باڑے کی مجلس اور پھر دوسرے درجہ پر ناظم صاحب مرحوم کے امام باڑے کی۔ جناب ناصر الملۃ اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے یہاں کی مجلسیں یا خطیب آل محمد مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ مرحوم کے پڑھنے کی مجلسیں شیخ علی عباس صاحب وکیل مرحوم کی کوٹھی میں۔ جناب غفران مآبؒ کے امام باڑے کی مجلسیں مجمع کے اعتبار سے بہت ہی کمزور ہوگئی تھیں۔ صرف اہل خاندان اور خاص مخلصین جناب غفران مآبؒ کی یادگار سمجھ کر یا کچھ مومنین حصول ثواب کے لئے ان میں شریک ہوتے تھے۔ یہ حالت تھی ان مجلسوں کی

جب جناب عمدۃ العلماء نے ان میں پڑھنا شروع کیا۔

آپ کے بیانات کی وجہ سے اس مجلس میں مجمع بڑھنا شروع ہوا اور حسینیۂ جناب جنت مآبؒ میں وقف خاص یا عام کے اختلافات اور پھر خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد سے یہ مجلسیں عشرۂ محرم کی شہر کی سب بڑی مجلسیں ہوگئیں۔

جناب عمدۃ العلماء یوں تو سال بھر تمام ملک میں سیکڑوں مجلسیں پڑھتے تھے اور خود لکھنؤ میں ایک ایک دن میں کئی کئی مجلسیں پڑھ دیتے تھے مگر اصل تیاری آپ حسینیۂ غفران مآبؒ کی مجلسوں کے لئے کرتے تھے اور یہاں کی مجلسوں کو جس پابندی کے ساتھ آپ نے پڑھا ہے وہ وضعداری بھی آپ کی سیرت کا بڑا امتیازی پہلو ہے جس پر محترم مدیر سرفراز نے بھی روشنی ڈالی ہے ان الفاظ میں کہ:

''وضعداری کا یہ عالم تھا کہ جمعہ کا دن زیادہ لکھنؤ ہی میں گزارا اس لئے کہ بہ حیثیت امام جمعہ آپ کو مسجد آصفی میں نماز کی قیادت کرنا پڑتی تھی۔ جس طرح جمعہ کا دن عمر بھر میں لکھنؤ ہی میں گزرا اسی طرح عشرۂ محرم میں بھی کبھی لکھنؤ سے باہر جانا پسند نہ کیا۔ ان ایام میں لکھنؤ کے تمام ذاکرین مجالس عشرہ کے سلسلے میں ملک کے مختلف حصوں میں چلے جاتے ہیں لیکن مرحوم نے کبھی عشرہ میں لکھنؤ چھوڑنا گوارا نہیں فرمایا بلکہ کم و بیش گذشتہ نصف صدی سے امام باڑہ غفران مآبؒ ہی کا عشرہ پڑھتے رہے۔''

۱۳۸۳ھ میں اس شدید علالت کی وجہ سے جو مرض الموت ثابت ہوئی آپ عشرۂ محرم کے مجالس نہ پڑھ سکے جس کا آپ کو شدید صدمہ تھا۔ پھر بھی تین مرتبہ عشرہ میں فینس پر مجلس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے اور عشرہ کے دن کی عصر کی مجلس میں چند منٹ کے لئے منبر پر جا کر بیان بھی فرمایا جو آخری ہونے کے لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

اس مجلس کا تذکرہ آپ کے بعد آپ کے سوانح کا ایک لازمی جز بن گیا ہے چنانچہ پرنس کوکب قدر صاحب لکھتے ہیں:

''عصر عاشور ۱۳۸۳ھ کی مجلس بھی تاریخی ہے کیونکہ جس منبر نے غفران مآبؒ کو خدمت دین میں بلند مرتبہ دیکھا اسی منبر کی بلندی سے سرکار مرحوم نے اپنی آخری مجلس پڑھی، نہ جسم میں تاب تھی، نہ زبان میں قوت گویائی لیکن واہ رے جذبہ خدمت۔ عصر عاشور کی مجلس نہ تھی ذاکری کا معجزہ تھا جو ظہور میں آیا۔''

بہت مستند کیفیت اس مجلس کی وہ سمجھی جاسکتی ہے جو بروقت یعنی عشرۂ محرم کے بالکل بعد ہی سرفراز مورخہ ۹ر جون ۱۹۶۳ء کے ایک ادارتی نوٹ میں جو ''عمدۃ العلماء مدظلہ کی رفتار صحت'' کے زیر عنوان شائع ہوا ہے درج ہے۔ وہ یہ ہے:

''یوم عاشور کی قدیم مجلس بھی جو ۴ر بجے سہ پہر کو امام باڑۂ غفران مآبؒ میں ہوتی ہے سرکار موصوف نے پڑھنے کی کوشش کی۔ کوئی بیس منٹ بیان فرمایا مگر بسم اللہ کہہ کر خطبہ شروع ہی کیا تھا کہ شاید اس خیال سے کہ امسال میں خود علالت کی وجہ سے مجالس نہیں پڑھ سکا ممدوح پر رقت

طاری ہوگئی جس کا اثر کافی دیر تک رہا۔ اس ضعف ونقاہت میں بہرحال پھر بھی بڑی کامیاب مجلس پڑھی۔ مجمع بھی ہر سال سے زیادہ تھا۔ ممدوح نے اپنے بیان میں اس مجلس کی تاریخ پر روشنی بھی ڈالی اور فرمایا کہ امام باڑہ ۱۲۱۰ھ میں تعمیر ہوا اور اس مجلس کی بنا حضرت غفران مآبؒ نے ۱۲۱۰ھ ہی سے ڈالی تھی اور مجلس کے بعد شبیہ ذوالجناح بھی نکالی جاتی تھی۔ یہ ذوالجناح اس امام باڑے سے جناب غفران مآبؒ کے شریعت کدہ تک جایا کرتا تھا اور وہ بڑا دلدوز سماں ہوتا تھا۔ اس کے بعد سے یہ ذوالجناح جناب علن صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کے زمانہ تک نکلتا رہا۔''

مرزا اسجاد حسین صاحب اترولوی نے لکھا ہے کہ:

''یہ ذوالجناح ۱۹۲۴ء تک جاری رہا۔ ۱۹۲۵ء سے حسینیۂ غفران مآبؒ میں مولوی جناب سید دلدار علی عرف متّے آغا صاحب رازؔ اجتہادی نے شبیہیں تیار کرا کے ۹ر محرم کی مجلس میں نکالنا شروع کیں جس کا سلسلہ آج تک باقی ہے اور وہ ذوالجناح جو عاشور کی مجلس کے بعد جناب غفران مآبؒ اور پھر جانشین غفران مآبؒ کے دولت کدہ پر جاتا تھا کسی خاص وجہ کی بنا پر بند ہوگیا۔'' (سرفراز لکھنؤ ۲ر جولائی ۱۹۶۳ء)

یہ باب نامکمل رہے گا اگر یہاں جناب ابوالمعارف متّے آغا صاحب رازؔ اجتہادی کے اس مضمون کا اقتباس درج نہ کیا جائے جس کی سرخی ہے ''عمدۃ العلماء کی عملی زندگی کا ایک ورق'' ۔۔۔۔۔۔۔ چونکہ موصوف کی حیثیت حسینیۂ غفران مآب طاب ثراہ کے متولی ومنتظم کی رہی ہے اس لئے ان کا بیان اس سلسلہ میں بڑی ذمہ دار حیثیت رکھتا ہے۔ موصوف تحریر فرماتے ہیں:

''میں مرحوم کی عملی زندگی میں سے صرف اس ایثار وقربانی کا کچھ تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو موصوف نے تعمیر حسینیۂ غفران مآبؒ ومجالس حسینیۂ مذکورہ کے سلسلہ میں کی ہے۔ ۱۹۱۱ء سے موصوف نے مجالس حسینیۂ غفران مآبؒ میں ذاکری شروع کی تھی۔ اس وقت مرحوم کی ابتدا تھی اور مولانا سید کاظم حسین صاحب قبلہ مرحوم نیز ان کے بھائی مولانا سید وجاہت حسین صاحب ناظم مرحوم سے اپنے مسودات پر اصلاح لے کے پڑھتے تھے۔

جب مرحوم حصول اجازات اجتہاد کے بعد عراق سے ہندوستان تشریف لائے اور مجالس حسینیۂ غفران مآبؒ کا انتظام میرے ہاتھ میں آیا، اس وقت سے میرے اور مرحوم کے مابین یہ معاہدہ ہوا کہ میں تاحیات مجالس کرتا رہوں گا اور جناب مرحوم ذاکری فرماتے رہیں گے اور کسی صورت میں عشرۂ مجالس حسینیۂ کو چھوڑ کے کہیں باہر تشریف نہ لے جائیں گے۔

میں تو بقاء عہد زمینداری تک ہی اپنے عہد پر قائم رہ سکا لیکن مرحوم نے اپنی آخری سانس تک اپنے عہد کو نباہ دیا چنانچہ اپنی شدید بیماری کے عالم میں بھی اپنی عمر کے آخری محرم کی عصر عاشورا کی مجلس ایسی حالت ضعف وناتوانی میں پڑھی کہ فینس منبر سے لگا دی گئی۔ مومنین کے سہارے سے فینس سے منبر پر تشریف لے گئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجلس ایسی کامیاب ہوئی کہ شاید کبھی ایسی مجلس نہ ہوئی تھی۔

ختم زمینداری کے بعد سے مجالس کا انصرام

وانتظام بھی کلیۃً انھوں نے اپنے ذمہ لے لیا۔ کیونکہ میں کوئی آمدنی نہ رہنے کی وجہ سے معذور ہو چکا تھا۔

سیکڑوں مقامات سے ہزاروں کی رقم کے وعدہ پر بلاوے آتے تھے لیکن موصوف نے کبھی منظور نہ فرمایا۔ ''مشتے نمونہ از خروارے'' صرف ایک واقعہ پیش کرتا ہوں:

حکیم محمد ذکی صاحب برادر خورد[۱] حکیم منّے آغا صاحب فاضلؔ مرحوم نیز میرے بچپن کے ساتھی تھے جن کو ہم دونوں کی بچپن کی دوستی پر ناز تھا۔ تقریباً تیس چالیس برس سے بمبئی میں مطب کرنے لگے تھے۔ ان سے تعلقات کا علم ہونے پر بمبئی کے ایک سیٹھ نے خواہش کی کہ آپ عمدۃ العلماء کو عشرۂ محرم کے مجالس کے واسطے جس قیمت پر بھی ممکن ہو بلا دیجئے۔ حکیم صاحب موصوف اپنے تعلقات پر نظر کرتے ہوئے وعدہ کر کے لکھنؤ تشریف لے آئے کہ میں جناب ممدوح کو ضرور لے آؤں گا چنانچہ جناب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اپنے بچپن کے تعلقات اور دوستی کی بنا پر جو کچھ بھی حکیم صاحب نے زور ڈالا ہو اس وقت میں موجود نہ تھا مگر جناب مرحوم کے ملازم نے آکر آواز دی کہ آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں خدمت میں پہنچا تو آپ نے ہنس کے فرمایا کہ بھائی ذکی صاحب چار ہزار روپیہ دلوانے کے وعدے پر مجھے بمبئی لے جانا چاہتے ہیں میں نے ان کو یہ جواب دیا ہے کہ جتنا مجھے یہاں کا عشرہ پڑھنے کا معاوضہ ملتا ہے اس سے زیادہ دلواؤ تو شاید چل سکوں۔ اب آپ ان کو بتلائیں کہ آپ مجھے کیا دیتے ہیں۔ حکیم صاحب موصوف نے مجھ سے پوچھا کہ کیا دیتے ہو؟ میں نے ہنس کے کہا کہ فی مجلس ایک ہزار روپیہ دیتا ہوں۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ علاوہ خرچ سفر وغیرہ کے پانچ ہزار تک تو میں کوشش کر کے دلوا دوں گا۔ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کو یہ کیسے یقین ہو گیا کہ میں ان کو کچھ دوں گا یا جناب مجھ سے کچھ لیں گے۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ جناب کی قربانی ان کو وہ کچھ دربار حسینی سے دلوا دے گی جو کوئی مادّی قوت نہ دے سکے گی۔ جناب مرحوم نے فرمایا کہ بھائی مجھے افسوس ہے کہ میں کسی قیمت پر بھی حسینیۂ غفران مآب علیہ الرحمہ کے مجالس ترک نہیں کر سکتا۔ اول تو خود میرا ضمیر ہی اس کو قبول نہیں کرتا۔ دوسرے میرا اور منے آغا صاحب کا معاہدہ۔ تیسرے والد صاحب مرحوم نے وصیت بھی فرمائی ہے کہ ان مجلسوں کو ترک نہ کرنا۔

[۱] ان کے والد جناب حکیم محمد کاظم صاحب طبیب ریاست بلہرہ حکیم منے آغا صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے چچا تھے۔ اس طرح وہ حکیم منّے آغا صاحب کے چچازاد بھائی تھے۔ (مرتب)

۔۔۔۔۔۔حسینیۂ غفران مآبؒ پہلے ۱۹۱۵ء کی برسات میں شکست وریخت کی زد میں آیا۔ مولانا سید سبط محمد ہادی عرف مولانا کلن صاحب کی کوشش سے کچھ اس کی مرمت ہو سکی۔ پھر ایک مرتبہ اس کی شہ نشین دھنس گئی۔ جناب عمدۃ العلماء نے ڈھائی تین ہزار روپئے کے خرچ سے میرے زیر نگرانی اس کی تعمیر کرائی۔

پھر ۱۹۳۶ء کے سیلاب میں اس کے دونوں پہلوؤں کے کمرے مسمار ہو گئے۔ جناب مرحوم نے لکھنؤ سے نیز جہاں بسلسلۂ ذاکری تشریف لے گئے حسینیۂ غفرانمآبؒ

کے واسطے بارہ ہزار روپے مہیا کیے۔ مرزا سجاد حسین صاحب کی نگرانی میں تعمیر کروائی جس کی وجہ سے تقریباً چھ سو روپے سالانہ حسینیۂ مذکورہ کی آمدنی ہوگئی۔ یہ رقم جناب ہی کی نگرانی میں مجالس میں صرف ہوتی رہی اور ہر خسارہ کو خود مرحوم اپنی جیب سے پورا کرتے رہے۔ جناب عمدۃ العلماء کی عملی زندگی کا یہ ایک مختصر سا نمونہ تھا جو پیش کیا گیا۔''

(پیام اسلام لکھنؤ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۴ء)

مجلس شام غریباں

پرنس کوکب قدر صاحب نے اس کے آغاز کا حال اس طرح درج کیا ہے کہ:

''۱۹۲۷ء کے عاشور کی شام تھی۔ مجلس کا فرش وغیرہ اٹھ چکا تھا۔ دن بھر کے تھکے ماندے مومنین ساور کے گرد ایران اور عراق کے تذکرے کر رہے تھے کہ کسی نے تجویز کیا کہ کیوں نہ اس وقت کو ذکر حسینؑ میں صرف کیا جائے چنانچہ لوگوں نے اس کو منظور کیا۔ یہ پہلی مجلس مولانا سبط محمد ہادی عرف کلّن صاحب نے پڑھی۔ خاطر خواہ اثر ہوا اور چونکہ ذکر حسینؑ کے لئے ایک اچھا عنوان تھا آئندہ سال زیادہ اہتمام کیا گیا۔''

مگر مرزا سجاد حسین صاحب اترولوی جن کا مضمون سرکار عمدۃ العلماء طاب ثراہ کی حیات میں نکلا تھا اور انھوں نے واقعات تواریخ وسنن کے پورے انضباط کے ساتھ اتنے تفصیل سے لکھے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بزرگان خاندان سے براہ راست مستند معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنا مضمون لکھا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں کہ:

''شام غریباں کی مجلس کا انعقاد ۱۹۲۸ء میں ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اس سنہ میں دو عرب، مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے لکھنؤ تشریف لائے۔ حسینیۂ غفران مآبؒ میں ان کے طعام وقیام کا انتظام جناب منّے آغا صاحب رازؔ اجتہادی نے کیا۔ عاشور کا دن گزار کر سہ پہر کے وقت فاقہ شکنی کے سلسلے میں چند حضرات حسینیہ میں موجود تھے۔ ساور روشن ہو چکے۔ فاقہ شکنی کا انتظام ہو چکا تو ایک عرب نے کہا کہ اس وقت اگر ذکر حسینؑ ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ اس کی تائید سب ہی حضرات نے کی۔ اسی وقت مجلس کا انتظام ہوا اور پہلی مجلس جناب مولانا سید سبط محمد ہادی عرف کلن صاحب قبلہ نے پڑھی۔ مجلس کے ختم ہونے پر جناب منے آغا صاحب رازؔ اجتہادی نے فرمایا کہ یہ مجلس ہمیشہ ہو اور اس کا نام ''شام غریباں'' رکھا جائے۔ جناب مولوی سید حسن اختر صاحب ہدفؔ اجتہادی مرحوم نے فرمایا کہ اس مجلس میں فرش وروشنی نہیں ہونا چاہئے۔ جناب مولوی شجاعت حسین عرف شجن صاحب مرحوم نے فرمایا کہ اس میں بطور شبیہ زوجۂ حر کا کھانا پانی لانا دکھایا جائے۔ حاضرین نے باتفاق آراء یہ سب تجویزیں منظور کر دیں۔ ۱۹۲۹ء میں بھی یہ مجلس مولانا سید سبط محمد ہادی عرف کلن صاحب قبلہ نے پڑھی۔ ۱۹۳۰ء سے سرکار عمدۃ العلماء نے یہ مجلس پڑھنا شروع کی۔ ہر اعتبار سے یہ مجلس ترقی کرتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۹ھ میں یہ طے کیا گیا کہ یہ مجلس ریڈیو سے براڈ کاسٹ کرائی جائے۔

اس اہم فریضہ کی انجام دہی کے واحد ذمہ دار مہاراجکمار محمود حسن خان اور حسینی شاعر جناب فضل لکھنوی ہیں۔ ان حضرات کی کوشش سے یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۹۴۰ء سے یہ مجلس ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہونے لگی۔'' (سرفراز لکھنؤ ۲ر جولائی ۱۹۶۳ء)

حسینیۂ غفران مآبؒ کی عزاداری کے کچھ اور مظاہر

چونکہ شام غریباں کا ذکر تفصیل سے ہوا، ضمناً مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب مرزا سجاد حسین صاحب اترولوی نے اس حسینیہ کے کچھ دوسرے مظاہرات کے آغاز سے متعلق جو معلومات درج کئے ہیں ان کا خلاصہ بھی محفوظ کر دیا جائے۔

۷ رمحرم، زنانی شب بیداری و تابوت جناب قاسم:

اس کی بنا ۷۵ ۱۳ھ میں جناب سید شمس الحسن صاحب تاجؔ نے ڈالی جو جناب سید الواعظین خطیب اکبر مولانا سید اولاد حسین صاحب شاعرؔ مرحوم کے فرزند اور جناب عمدۃ العلماء طاب ثراہ کے خویش ہیں۔

زنانی شب بیداری ۶ رمحرم کا دن گذر کر شب میں ہوتی ہے اور اسی شب جناب قاسمؑ کا تابوت سج کر امام باڑے میں رکھ دیا جاتا ہے جو ۷ رمحرم کو مجلس کے بعد مومنین کی زیارت کے لئے نکالا جاتا ہے۔

۸ رمحرم، علم فاتحِ فرات:

اس کی بنا ۷۸ ۱۳ھ میں پڑی۔ یہ علم دریا والی مسجد سے اٹھ کر حسینیۂ غفران مآبؒ میں لایا جاتا ہے۔ پہلے سال اس کی مجلس حضرت عمدۃ العلماء طاب ثراہ نے پڑھی تھی مگر ۷۹ ۱۳ھ سے اسے مرحوم کے چھوٹے فرزند جناب مولانا سید کلب صادق صاحب پڑھ رہے ہیں۔

شب عاشور:

جناب مرزا سجاد حسین صاحب اترولوی کا بیان ہے کہ یہ شب بیداری ۷۶ ۱۳ھ سے خود مرزا صاحب موصوف کی قائم کی ہوئی ہے جو ترقی کرتی جاتی ہے۔

صبح عاشور:

اسی طرح ۷۷ ۱۳ھ سے عاشور کی نماز صبح جو جناب عمدۃ العلماء طاب ثراہ پڑھاتے رہے۔

آخری مجلس شام غریباں

پانزدہ روزہ ''خطیب'' کراچی میں جو بیادگار عمدۃ العلماء طاب ثراہ ان کے خالہ زاد بھائی اور داماد جناب عماد العلماء مولانا سید محمد رضی صاحب مجتہد نبیرۂ نجم الملۃ اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی زیر سرپرستی نکلا ہے ۱۵ رمئی ۱۹۶۴ء کے شمارہ میں اس مجلس کو تمام و کمال شائع کیا ہے جو یقیناً ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو اُن ہی سرخیوں اور مدیر کے افتتاحی نوٹ کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سرکار عمدۃ العلماء کی آخری مجلسِ شام غریباں

بستر مرگ پر چراغِ حسینیت کی ضیاباری

حیات کے آخری لمحوں میں کانپتے ہوئے قلم کا آخری شاہکار

ہم ''خطیب'' کے قارئین کرام کے سامنے اس

عظیم شاہکار کو پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں جو مجلس شام غریباں کے عنوان پر ذاکر شام غریباں سرکار عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ مجتہد طاب ثراہ نے اپنے آخری لمحات حیات میں بستر مرگ پر تحریر فرمایا تھا اور جسے وہ ضعف ونقاہت کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکے بلکہ اسے ان کے فرزند سعید مولانا سید کلب صادق صاحب قبلہ نے پڑھا تھا۔ یہ حسینیت کا کھلا ہوا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ جس مریض نے مہینوں سے غذا نہ کھائی ہو اور جو ایک گھونٹ پانی بھی حلق سے نہ اتار سکتا ہو اور جس کی طاقت وقوت جواب دے چکی ہو، جس سے کروٹ لینا بھی مشکل ہو، بات کرنے میں اذیت محسوس کرتا ہو اور چند ہی روز کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہنے کو تیار ہو، وہ کربلا کی اس شام غربت پر مضمون لکھے جس کا تصور سنگ خارا کے دل میں چھالے ڈال دے اور پتھروں میں آبلے پیدا کر دے۔

عمدۃ العلماء کی شخصیت بھی ایک مثال تھی اس کردار کی جس کی کربلا والوں نے تعلیم دی ہے۔ جس طرح مجاہدین کربلا نے زخموں اور خون کے طوفان میں بھی ہمیشہ اپنے آقا کو یاد رکھا عمدۃ العلماء نے بھی اپنی ساری زندگی خدمت حسینی میں لگا دی اور بستر مرگ پر اپنی آخری کروٹوں میں بھی حسینؑ کو نہ بھولے۔ (مدیر)

شام غریباں میں میری زبان سے پورے انہماک کے ساتھ میرا بیان سننے والے خصوصاً حاضرین مجلس! آپ جانتے ہیں کہ میں کئی ماہ سے بیمار ہوں۔ نہ دماغ کام کرتا ہے نہ دل، آواز بھی میری مدد کرنے سے منکر ہے۔ اس عالم میں کیا کہوں اور کیونکر کہوں۔ ہمت ساتھ چھوڑ رہی ہے، قوت جواب دے رہی ہے، حافظہ مدد کرنے پر تیار نہیں ہے۔ کس سے کہوں کہ مجھ کو کچھ بتا دو۔ کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ ہم نے کربلا کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ہاں ہاں ٹھنڈی روشنی ڈالنے والا چاند، یہ ستاروں کی بزم میں گردش کرتا ہوا ماہتاب بتا سکتا ہے۔ حالات کربلا سنا سکتا ہے۔ اچھا تو اے شب کے پردے میں سفر کی منزلیں طے کرنے والے تو ہی بتا دے کہ حسینؑ کون تھے؟ کیوں کربلا میں آئے تھے؟ کس نے ان کو شہادت کی منزل تک پہنچایا؟ یہ شام غریباں کا منظر دنیا میں کیونکر پیش آیا؟ سنیے یہ آپ کا روشن ستارہ زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ پوچھنے والے تو نے مجھ کو چھیڑ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ میں تو ستاروں کے اشکوں سے خود ہی روتا رہا تھا تو نے مجھ کو اور رُلا دیا۔ دریافت کرتا ہے تو سن لے کہ حسینؑ بن علیؑ جن کے ماتم کی صف ہر دوست کے گھر میں بچھی ہوئی ہے رسول عربیؐ کے بڑے محبوب نواسے تھے۔ ان کی صاحب زادی فاطمہ زہراؑ کے دل کے ٹکڑے تھے۔ علیؑ بن ابی طالبؑ کے نور نظر تھے۔ نانا کی آغوش تربیت میں رہ کر اسلام کی تخم پاشی دیکھ چکے تھے۔ باپ کی جانفشانیاں پیش نگاہ تھیں۔ ماں کی گود میں آن کر اسلام سے محبت، مسلمانوں پر مرحمت، ہر وقت دین اسلام کی حفاظت کی فکر دیکھ چکے تھے۔ رسول اسلامؐ نے بھی مختلف صورتوں سے دکھا دیا کہ اسلام کی حفاظت کیوں کر کی جاتی ہے۔ مباہلہ کے میدان میں لا کر سمجھا دیا تھا کہ اسلام کی حقیقت کا ثبوت کیونکر پیش کیا جا سکتا ہے۔ کسی

کی نگاہ سے پوشیدہ نہ تھا کہ اسلام کے بعض دشمن کس طرح اسلام کی نقابیں چہروں پر ڈال کر اسلام کے مٹا دینے میں کوشاں ہیں تو حسینؑ کی نگاہوں سے کیونکر پوشیدہ رہتا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ سچا مسلمان کون ہے؟ منافق کون ہے؟ اسلام کی پرورش کرنے والا کون ہے؟ اسلام کی بقا کا دشمن کون ہے؟ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد ہر منظر حسینؑ کی نگاہ سے گذرا مگر باپ کی سرپرستی میں انہی کے طرز عمل پر گامزن رہے۔ باپ کی خانہ نشینی بھی دیکھی اور سلطنت کے دور پر بھی غور کی نگاہ کرتے رہے یہاں تک کہ علیؑ نے بہ ظلم وستم شہادت پائی۔ اب بڑے بھائی کے طرز عمل کو دیکھا۔ ان کی بھی زہر سے شہادت ہوئی مگر حسینؑ نے باپ کے طرز عمل کو دس برس تک امیر شام کے دورِ حکومت میں نباہ کے بتا دیا کہ ہم کو اگر چھیڑا نہ جائے تو خاموشی سے تبلیغ اسلام وحفاظت اسلام میں عمر بسر کردیں گے مگر جب امیر شام کی رحلت کے بعد یزید بر سر حکومت آیا تو بخدا میرا ایمان ہے کہ اگر حسینؑ کو نہ چھیڑتا تو حسینؑ مثل سابق خاموشی میں عمر بسر کر دیتے مگر مجھ کو وہ رات بھی یاد ہے جب اس چاند کے غروب کے دن قریب تھے۔ ۲۵، ۲۶ تاریخ ماہ رجب ۶۰ھ کی گزر چکی تھی، جب ولید حاکم مدینہ نے حسینؑ کو بلایا۔ سنو! تمہارے امام چند بنی ہاشم کو ساتھ لے کر ولید کے مکان پر آئے سب کو دروازے کے باہر چھوڑا۔ خود تنہا ولید کے سامنے پہنچے۔

اب تک حسینؑ کی بہ ظاہر عزت کرنے کا طریقہ جاری تھا۔ ولید نے عزت واحترام کے ساتھ اپنے پہلو میں بٹھایا۔ یزید کا خط ہاتھوں میں دے دیا جس میں انتقال امیر شام کی خبر کے بعد ولید کو حکم دیا گیا تھا کہ جس طرح ہو حسینؑ سے بیعت لو یعنی میری اطاعت کا اور میری حقیت کا اقرار کرالو۔ اب کوئی کہتا ہے کہ یہ بھی حکم تھا کہ اگر نہ مانیں تو سر کاٹ لو، کوئی کہتا ہے یہ نہیں تھا۔ بہر حال حسینؑ نے خط پڑھا اور فرمایا اس شب کے پردے میں بیعت کرنا نہ میرے واسطے مناسب ہے نہ تم ہی اس کو پسند کرو گے۔ لہٰذا رات بھر تم بھی غور کرو کہ بیعت کرنا میرے واسطے مناسب ہے یا نہیں اور میں بھی غور کروں گا۔

ولید نے منظور کرلیا مگر مروان جو خود بھی بنی امیہ سے تھا بول اٹھا کہ ولید کیا کرتے ہو۔ اگر اس وقت حسینؑ قبضہ سے نکل گئے تو پھر سخت خون ریزی کے بغیر قابو میں نہ آئیں گے لہٰذا یا تو اسی وقت ان سے بیعت لو یا سر کاٹ لو۔ یہ سن کر حسینؑ کو غصہ آیا۔ تلوار ٹیک کر کھڑے ہوگئے اور بلند آواز سے فرمایا مروان تیری یہ مجال ہے کہ میرا سر کاٹ لے یا ولید کی یہ مجال ہے؟ بس اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ تمام بنی ہاشم تلواریں کھینچ کر ولید کے مکان میں داخل ہوگئے۔ حسینؑ نے سب کو سمجھا بجھا کر روکا کہ بس بس۔ ہم پیش دستی نہیں کرتے۔ خبردار تلوار نہ اٹھانا۔

اہل بزم سنو۔ سنو! یہ فلک کی منزلیں طے کرتا ہوا چاند زبانِ حال سے تم سے انصاف کا طالب ہے کہ اگر حسینؑ اس وقت بنی ہاشم کو روک نہ دیتے تو مروان زندہ نہ بچتا، نہ ولید کا دارالامارہ پر قبضہ ہوجاتا۔ صبح کو حسینؑ خلافت کا، حکومت کا اعلان کر دیتے۔ حسینؑ اتنے بے اثر نہ تھے کہ اعلان خلافت کے بعد دس بیس ہزار ساتھ نہ ہوجاتے مگر نہیں حسینؑ نے یہ

گوارا نہ کیا۔ کیوں؟ کس نے اتنے اچھے موقع کو ہاتھ سے نکل جانے دیا۔ سنو سنو! ایمان کی تو یہ ہے کہ اگر حسینؑ اسی وقت انقلاب کر دیتے تو ابھی یزید کی حکومت کو چند ہی دن گذرے تھے۔ لوگوں پر یزید کی بداعمالی، بدکرداری، بے دینی، اسلام دشمنی ظاہر نہ ہوئی تھی۔ اس لئے لوگ امام حسینؑ پر الزام دیتے۔ فتنہ وفساد کا بانی قرار دیتے۔ اس الزام سے بچنے کے لئے امام حسینؑ خاموشی سے ولید کے گھر سے نکل آئے دو دن میں سامان سفر درست کرلیا اور اپنے اہل وعیال کو لے کر یمن نہیں گئے جہاں حسینؑ کے دوستوں کی کثرت تھی۔ کوفہ نہیں گئے جہاں علیؑ مدتوں شاہی کر چکے تھے بلکہ مکہ چلے آئے جہاں کعبہ ہے جس کو دارامن وامان کہا جاتا ہے، جہاں ہر شخص کو پناہ دی جاتی ہے تا کہ لوگ یہ دیکھ لیں کہ میں فتح کی غرض سے نہیں نکلا ہوں بلکہ خدا کے گھر میں پناہ لینے آیا ہوں۔ یہاں امام حسینؑ نے چار ماہ آٹھ دن گزارے۔ اب اتنی مدت میں تمام دنیا کو اچھی طرح معلوم ہو گیا یزید انسان ہے یا حیوان، بشر ہے یا شیطان، بدکردار ہے یا خوش اخلاق ہے، مسلمان ہے یا کافر ہے، مومن ہے یا منافق ہے؟ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عراق سے جہاں کوفہ ہے ہزاروں خط حسینؑ کے پاس آ گئے کہ ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ ہم گمراہی میں ہیں۔ آیئے اور ہماری ہدایت کیجئے۔ جو لوگ محض دنیا پرست ہیں، دنیا کے نفع اور نقصان پر نظر رکھتے ہیں وہ ہرگز نہیں سمجھ سکتے کہ دین کی ہدایت کرنے والوں کو مجبوریاں کیا ہوتی ہیں؟ خدا کی بارگاہ میں جواب دہی کا ڈر ہی اُس عمل پر تیار کر دیتا ہے جس کا ترک کرنا دنیا پرست ضروری سمجھتے ہیں۔ حسینؑ بھی دین کے محافظ تھے۔ خدا کے یہاں جواب دہی کا ڈر تھا لہٰذا جب ہدایت کے لئے بلایا گیا تو جانے پر مجبور ہوئے مگر پہلے اپنے بھائی مسلمؑ بن عقیل کو بھیجا۔ ان کا خط بھی کوفہ سے آیا کہ آپ ضرور آیئے سب آپ کی تشریف آوری کے مشتاق ہیں۔ ادھر یہ طلب پر طلب اور ادھر مکہ کے حاجیوں کے ہجوم میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ حسینؑ کو زیادہ ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔ اب امام حسینؑ بقرعید کی آٹھ تاریخ کو تمام عورتوں اور بچوں کو لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ میرا ایمان ہے کہ حسینؑ سفر کے نتائج سے خوب واقف تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ منزل شہادت کیا ہے مگر بظاہر تو کوفہ ہی جا رہے ہیں۔ راستے میں، منزلوں میں لوگ قافلہ کے ساتھ ہونے لگے کہ امام حسینؑ شاہی لینے کوفہ جا رہے ہیں مگر حسینؑ نے ہر ایک کو یہ بتا بتا کر علٰحدہ کر دیا کہ نہ معلوم آخری نتیجہ کیا ہو۔ تم میرے ساتھ ہرگز نہ چلو یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے قافلہ ایک ایسی منزل پر آ گیا جہاں کوفہ کے دو آنے والے مسافروں نے امام حسینؑ سے عرض کیا کہ ہم ایک بہت بری خبر لے کے آئیں ہیں۔ آپ سب سے الگ ہو کر سنیئے تو بہتر ہے مگر حسینؑ نے منظور نہیں کیا۔ فرمایا سب کے سامنے کہو۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ جب ہم کوفہ سے نکلے ہیں تو جن جن لوگوں نے آپ کو خط لکھے تھے ان سب نے بے وفائی کی اور آپ کے ایلچی مسلم بن عقیل کو بہ ظلم وستم قتل کر دیا اور لاش بھی دفن نہ ہونے دی۔ اس خبر کو سن کر جو ادھر اُدھر کے لوگ جمع ہو گئے تھے سب الگ ہو گئے مگر حسینؑ کے ارادہ میں فرق نہیں آیا اور آگے بڑھ کر حسینؑ کے ایک نامہ بر کے قتل کی بھی خبر ملی مگر حسینؑ کا ارادہ نہ

بدلا۔ بڑھتے بڑھتے یزیدی لشکر کے سردار حُر نے ایک ہزار سواروں کے ساتھ راستا روکا۔ حسینؑ نے دیکھا کہ سارا لشکر پیاسا ہے۔ اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ سب کو پانی پلاؤ۔ پورے لشکر کی مع گھوڑوں کے پیاس بجھا دی گئی۔ بعض کو حسینؑ نے اپنے ہاتھ سے پانی پلایا۔ اب حسینؑ نے دریافت کیا کہ کیوں آئے ہو۔ حُر نے جواب دیا کہ مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ کو اپنی نگرانی میں پہنچا دوں۔ حسینؑ نے فرمایا کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تمہارا قیدی بن کے کوفہ جاؤں۔ حُر نے اصرار کیا۔ حسینؑ نے انکار کیا۔ امام حسینؑ کے دوستوں نے عرض کی مولا! ان سے لڑنا ابھی آسان ہے۔ حکم دیجئے تو لڑیں۔ فرمایا ہرگز نہیں ہم جنگ کی ابتدا ہرگز نہ کریں گے۔ اس کے بعد حسینؑ نے قافلہ کو روانگی کا حکم دیا۔ قافلہ کا رخ کربلا کی طرف موڑ دیا گیا۔ اس طرح حسینؑ اس کربلا میں پہنچ گئے جہاں آج کی تاریخ شامِ غریباں کا منظر دل شکن تھا۔

اے میرے پرنور سیارے، اے فلک کی منزلوں سے گزرتے ہوئے ماہتاب! ابھی کچھ آنکھوں دیکھا حال اور بھی تو بیان کردے۔

اچھا سنو! کربلا کی نہر نے حسینؑ کو قریب آنے کی دعوت دی۔ باغوں کے سائے نے اپنے دامن میں خیمے لگوانے کی تمنا پیش کی۔ غبار نے اڑ کے استقبال کیا مگر لشکر حر کے روکنے سے حسینؑ چٹیل میدان، بے آب و گیاہ زمین پر اتر پڑے۔ راتوں پر راتیں اور دنوں پر دن گزرنے لگے۔ لشکروں کی کثرت بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ ۷ محرم سے لشکر نے پانی بھی بند کردیا۔ آٹھ گذری، نو گذری اور شبِ عاشور آئی۔ آہ میں فلک کی بلندی سے دیکھا رہا تھا کہ حسینؑ کے چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے تڑپ رہے تھے مگر میں نے بہت غور سے دیکھا کہ عورتوں میں، مردوں میں، عزیزوں میں، غیروں میں کسی کی بھی زبان سے پیاس کی لفظ نکلی؟ ہرگز نہیں۔ سب عبادتیں کررہے تھے، نمازیں پڑھ رہے تھے۔ پانی تو ممکن نہ تھا۔ زمین کربلا پر نمازیوں نے تیمم کرکے مصلے بچھا دیئے اور امام کے ساتھ نماز جماعت شروع ہوئی۔ دعاؤں میں ہاتھ اٹھے مگر فتح وظفر کی دعائیں نہ تھیں، پیاس کا شکوہ نہ تھا۔ بے کسی کی شکایت نہ تھی مگر صبر کی، ثبات قدم کی، دین پر قائم رہنے کی دعائیں۔

اے زبان حال سے داستانِ غم سننے والو! ابھی صبح کی ہلکی روشنی میں میں بھی ضیاباری کررہا تھا۔ مصلے اٹھنے نہ پائے تھے کہ دشمن کے لشکر سے پیغام جنگ لے کر تیر آئے۔ یہ گستاخی دیکھ کر بہادروں کے چہروں پر سرخی دوڑی، بڈھوں نے کمر کسی، جوانوں نے تلواروں کے قبضے پر ہاتھ ڈالے اور کمسن بھی تیوریوں پر بل ڈال کے جوانوں کے پہلوؤں میں کھڑے ہوگئے۔ لڑائی شروع ہوئی۔ تیروں کی بوچھار میں حسینؑ کے بہت سے ساتھی شہید ہوگئے اب ایک ایک دوست حسینؑ کا میدان میں آیا۔ جنگ کی اور شہید ہوئے۔ جب سب دوست قتل ہوچکے تو عزیزوں کی نوبت آئی۔ حسینؑ کے چچا عقیل کی اولاد نے پیش قدمی کی۔ وہ بھی سب شہید ہوئے۔ اب جناب زینبؑ کے فرزند میدان میں آئے وہ بھی شہید ہوئے۔ اب حسینؑ کے بھائی حسنؑ کے فرزندوں نے بڑی بہادری سے جان نثار کی اب حسینؑ کے

بھائی شہادت کی منزل پر آئے۔ وہ بھی قتل ہوئے اب بھائیوں میں صرف عباس بن علیؑ باقی تھے۔ حسینؑ سے اجازت مانگی۔ حسینؑ اس بھائی سے بہت محبت کرتے تھے۔ فرمایا عباس مرنے سے پہلے بچوں کی پیاس بجھا دو۔ عباس دشمن کے لشکر کے قریب آئے۔ دشمنان دین بنی ہاشم کے قتل کرنے والو! یہ نہر کا پانی موجیں مار رہا ہے اور حسینؑ کے بچے پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ جواب ملا کہ جب تک حسینؑ بیعت نہ کریں گے ایک قطرہ نہ ملے گا۔ شاید یہ آواز خیموں میں پہنچ گئی۔ بچوں کو معلوم ہوا کہ ہم کو پانی نہیں ملے گا۔ یکبارگی بچوں کی ''ہائے ہم کو پیاس نے مارڈالا'' یہ آواز جناب عباسؑ نے سنی، امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اے میرے امام! اے میرے آقا! اتنی تو اجازت دے دیجئے کہ بچوں کے واسطے نہر سے پانی لے آؤں۔ حسینؑ نے سر جھکایا۔ عباس نے سوکھی سی مشک اٹھائی۔ نہر کی طرف گھوڑا بڑھایا۔ تمام دنیا کے انصاف کرنے والے تاریخیں دیکھ کر مجھ کو جواب دیں کہ پہلی منزل سے حسینؑ کی شہادت تک، بیسوں مرتبہ دشمن نے سوال بیعت کیا۔ حسینؑ نے انکار کیا۔ پانی بند ہوا، پیاس بھڑکی، دوست قتل ہوئے، عزیز شہید ہوئے مگر کسی ایک نے بھی حسینؑ کو یہ مشورہ نہ دیا کہ بیعت کر لیجئے۔ دوستوں نے، عزیزوں نے، مردوں نے، عورتوں نے، چھوٹے چھوٹے بچوں نے کسی نے بھی کہا کہ آقا اب تو پیاس کے مارے دم نکلے جاتے ہیں۔ آقا بیعت کر کے ہماری جان بچا لیجئے۔ خدا گواہ ہے کہ کسی نے بھی یہ نہیں کہا۔ تو معلوم ہوا کہ بیعت کرنا ایسا ہی محال تھا، ناممکن تھا کہ زینبؑ نے یہ کہا کہ اپنے دوستوں کو مدد کے لئے بلایئے۔ سکینہ نے حسینؑ کی چھوٹی بچی نے یہ کہا کہ ہم کو نانا کے روضے پر پلٹا دیجئے مگر یہ ایک نے نہ کہا کہ بیعت کر کے ہماری جان بچا لیجئے۔

بہرحال عباس مشک لئے ہوئے نہر پر آئے۔ ہزاروں کو مار بھگایا۔ نہر سے پانی بھرا۔ لے کر پلٹے۔ اب پوری کوشش ہے کہ میں زندہ رہوں یا نہ رہوں مگر پانی پہنچ جائے کہ یکا یک ایک دشمن نے درخت کی آڑ سے نکل کر ایسی تلوار ماری کہ داہنا ہاتھ کٹ کر گر گیا۔ عباس نے بائیں ہاتھ میں تلوار لی۔ دوش پر مشک رکھی۔ یوں ہی جہاد کیا مگر ایک دشمن نے بائیں ہاتھ پر تلوار لگائی۔ وہ ہاتھ بھی کٹ گیا۔ اب عباس نے دانتوں میں مشک سنبھالی مگر مشک پر تیر پڑا۔ پانی بہہ گیا۔ سر پر گرز پڑا۔ عباس گھوڑے سے گرے۔ اب حسینؑ کے پاس ایک نوجوان فرزند تھا جس کی اٹھارہ برس کی عمر، بے حد حسین، بے حد خوبصورت، رسول عربیؐ کی تصویر۔ اسی فرزند نے ہاتھ جوڑ کر جنگ کی اجازت مانگی۔ حسینؑ نے فرمایا مجھ سے اجازت کیا لیتے ہو، ماں سے رخصت لو۔ بڑی پھوپھی نے ۱۸ر برس مشقت سے پالا ہے۔ ان سے مل لو۔ باپ کے حکم سے علی اکبرؑ خیمے میں داخل ہوئے، پردوں کی آڑ تھی۔ کوئی کیا بتائے کہ ماں نے کیونکر اجازت دی۔ بہن کو کیونکر سمجھایا۔ پھوپھی سے کیونکر رخصت ہوئے۔ جن ماؤں کے جوان فرزند ہوں خدا ان کے فرزندوں کو صحیح وسالم رکھے۔ وہ بتائیں کہ ماں نے کس نگاہ حسرت سے دیکھا ہوگا۔ کس طرح دل تھام کر زمین پر بیٹھ گئی ہوں گی۔ چھوٹی بہنوں

نے کیونکر دامن چھوڑا ہوگا۔ جس پھوپھی کے دو بچوں کی لاشیں میدان سے آچکی ہیں اس نے کیونکر مرنے کی اجازت دی ہوگی۔ ہاں مجھ کو اتنا معلوم ہے کہ خیمے کا پردہ اٹھتا تھا اور گرتا تھا، اٹھتا تھا اور گرتا تھا جب علی اکبرؑ چاہتے تھے کہ باہر نکلیں تو بی بیاں چمٹ جاتی تھیں۔ بہرحال کسی نہ کسی صورت سے سب کو رخصت کیا۔ علی اکبرؑ باپ کے پاس آئے۔ حسینؑ نے نظر حسرت سے فرزند کا چہرہ دیکھا۔ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ''میرے پیدا کرنے والے! گواہ رہنا کہ اب وہ جوان مرنے جاتا ہے جو صورت اور سیرت میں تیرے رسول کی تصویر تھا۔ یہ کہہ کر علی اکبر کو اجازت دی۔ جوش شجاعت میں علی اکبر گھوڑا بڑھا کر چلے۔ مڑ کر دیکھا کہ امام حسینؑ گھوڑے کے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ علی اکبر نے گھوڑا روک کر عرض کی بابا یہ کیا؟ آپ تو مجھ کو رخصت کر چکے تھے حسینؑ نے فرمایا کہ بیٹا دل نہیں مانتا۔ جب تک میرا تیرا سامنا رہے۔ مڑ مڑ کر دیکھتا جا۔ بہرحال علی اکبر میدان میں آئے۔ بڑی شجاعت سے جنگ کی۔ آخر گھوڑے سے گرے۔ باپ کو مدد کے واسطے نہیں پکارا بلکہ آواز دی تو صرف یہی کہ میرے چاہنے والے باپ! میرا آخری سلام لیجئے۔ حسینؑ نے آواز سنی۔ کس طرح میدان میں آئے کیونکر جوان کی لاش اٹھائی؟ کون بیان کرسکتا ہے۔

بہرحال اب حسینؑ کے سوا کوئی نہ تھا۔ آخری رخصت کو خیمہ کے در پر آئے۔ آواز دی، میری بہنو! میرا آخری سلام لو۔ میرے دوستوں کی عورتو! تم پر بھی میرا سلام، میری معصوم بچیو! سلام قبول کرو۔ اے میری ماں کی کنیز فضّہ یہ حسینؑ تم پر سلام کرتا ہے۔

یہ آواز سن کر عورتیں، بچے ڈیوڑھی پر آ گئے۔ میں حالات رخصت کہاں تک بیان کروں مگر مختصر اتنا کہ بڑی بہن زینب نے چھ ماہ کے بچے علی اصغرؑ کو لاکر گود میں دیا۔ بھیا بھیا! اس کی پیاس تو دیکھئے۔ اب چند لمحوں کا مہمان ہے۔ میرے بھائی اس کو دشمنوں کے سامنے لے جائیے۔ ذرا حال تو دکھائیے۔ مجھ کو یقین ہے کہ اس کو پانی ضرور مل جائے گا۔ حسینؑ خوب جانتے تھے کہ بچہ کا کیا حشر ہوگا مگر بہن کی فرمائش سے بچے کو گود میں لے لیا۔ کیا کہتے؟ کیونکر بہن کا دل توڑتے کہ یہ ظالم ہرگز رحم نہ کریں گے۔ بچہ کو عبا اُڑھائی۔ دھوپ سے بچاتے ہوئے ایک بلندی پر لائے۔ عبا ہٹائی۔ بچے کو دونوں ہاتھوں پر سنبھال کے بس اتنا بلند کیا کہ بچہ کا گلا حسینؑ کے شانے سے مل گیا۔ پیاس سے بے حال بچہ گردن ڈالے ہوئے، چہرہ مرجھایا ہوا، ہونٹ سوکھے ہوئے دشمن کے سامنے پیش کرکے فرمانے لگے میرے دشمنو! میرے عزیزوں کو قتل کرنے والو! ذرا اس بچے کو دیکھ لو۔ یہ لڑنے نہیں آیا ہے۔ دو بوند پانی مانگنے آیا ہے تم خود اپنے ہاتھ سے پلا دو۔ دشمن رو دیئے۔ لشکر میں ہلچل مچ گئی مگر سردار لشکر عمر سعد کو رحم نہ آیا۔ ایک زبردست تیز انداز کو حکم دیا کہ کیا دیکھ رہا ہے۔ نشانہ زد پر ہے۔ آج ہی تو تیری نشانہ بازی کا امتحان ہے۔ اس ملعون نے کمان دوش سے اتاری، تیر کمان میں جوڑ کر بھرپور قوت سے کمان کھینچی، تیر چلا، بچے کا گلا چھیدتا ہوا حسینؑ کے بازو میں پیوست ہوگیا۔ روایت تو کہتی ہے کہ بچہ ہاتھوں پر الٹ گیا۔ مگر عزادارو! تم ہی بتاؤ کہ اگر

تیر صرف بچے کے گلے پر پڑا ہوتا تو بچہ الٹ سکتا تھا۔ کروٹ بدل سکتا تھا لیکن جب وہ تیر بچے کے گلے اور حسینؑ کے بازو میں پیوست ہوگیا تو بچے نے سمیٹے ہوں تو ہاتھ سمیٹے ہوں مگر سر اور گلا تو ہل ہی نہیں سکتا تھا۔ ہاں جب حسینؑ نے قوت صرف کر کے تیر نکال لیا ہوگا تو اب بچے نے کروٹ بدلی ہوگی یا باپ کے گلے میں باہیں ڈال دی ہوں گی۔

یہ دل شکن منظر بھی ختم ہوا۔ اب حسینؑ کے صبر کی آخری منزل تھی۔ کسی کی قبر نہیں بنائی مگر اس بچے کی لاش لے کر زمین پر بیٹھ گئے۔ تلوار سے ایک گڑھا کھودا۔ بچے کو قبر میں لٹایا۔ اس مقام پر جاوید اجتہادی مرحوم کا ایک شعر سن لیجئے:

قبر میں اصغر کو رکھ کے رو کے فرماتے تھے شاہ
یہ تو آغوشِ لحد میں اور پیارا ہوگیا

اب حسینؑ کے خزانے میں اپنے نفس کے سوا کچھ نہ تھا لہٰذا گھوڑے پر بیٹھے، تلوار نکالی، دشمن سے جنگ کی۔ بعض دشمنانِ حسین، عقل سے خالی کہتے ہیں کہ حسین میں جنگ کرنے کا دم ہی نہ تھا۔ کبھی چلتے تھے، کبھی بیٹھ جاتے تھے۔ کبھی نہر کا رخ کرتے تھے مگر انصاف کرنے والے ایمان سے بتاؤ کہ اگر حسینؑ کی یہ حالت ہوتی تو کون حسینؑ کو قتل کرتا، کون حسینؑ کو شہید کرتا۔ لشکر والے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالتے، بیڑیاں پہناتے اور کوفہ کے گورنر ابن زیاد کے سامنے پیش کر دیتے۔ جیسا کہ ان لوگوں نے امام حسینؑ کے بیمار فرزند زین العابدینؑ کے ساتھ سلوک کیا تھا ویسا ہی سلوک حسینؑ سے کرتے اور پھر حسینؑ گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اسی لئے حسینؑ نے تلوار اٹھائی اور لڑنا شروع کیا۔ بڑی شجاعت سے لڑے۔ بڑی بہادری سے لڑے۔ تیروں نے جگر چھلنی کر دیا۔ نیزوں نے دل چھید ڈالا۔ تلواروں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پتھروں نے زخمی کیا۔ اب گھوڑے پر سنبھل نہ سکے۔ زمین پر گرے مگر فوراً کھڑے ہو گئے۔ پھر لڑنا شروع کیا۔ صرف اس خیال سے کہ مجھ کو دشمن قید نہ کر لیں۔ جب کھڑے ہونے کی طاقت نہ رہی تو زمین پر بیٹھ گئے مگر زخموں کی کثرت سے کسی کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ حسینؑ زندہ رہیں گے۔ خود دشمن کے لشکر کی گواہی سنیئے! ہلال، عمر سعد کے پاس آیا اے سردارِ لشکر! حسینؑ پر پیاس کی شدت ہے۔ ایک ایک سے پانی مانگ رہے ہیں۔ زخموں کی اتنی کثرت ہے کہ پانی دے بھی دیا جائے تو زندہ نہ رہیں گے۔ اگر اجازت ہو تو میں پانی پلا دوں۔ عمر سعد نے سر جھکا یا۔ ہلال دوڑ کر نہر پر آیا۔ پانی لے کر چلا کہ حسینؑ کو پلا دوں مگر ابھی قریب بھی نہ پہنچا تھا کہ زمین کو زلزلہ آیا، غبار اٹھا۔ آفتاب کو گہن لگا۔ لشکر نے خوشی میں اللہ اکبر کی آوازیں بلند کیں اور فلک سے آواز آئی: "اَلاَ قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلاَ اَلاَ ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلاَ۔" سننے والوں سن لو حسینؑ کربلا میں قتل ہو گئے۔ حسینؑ کربلا میں ذبح کر دیئے گئے۔ ادھر حسینؑ شہید ہوئے ادھر عمر سعد نے حکم دیا کہ لاش کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا جائے۔ حکم کی دیر تھی۔ میدان میں گھوڑے دوڑنے لگے۔ جب یہ مصیبت ختم ہوگئی تو اب لشکر نے خیموں کا رخ کیا۔ اسباب لٹنے لگا۔ شہزادیوں کے زیور چھینے جانے لگے۔ اے پردہ دار بی بیو! دل تھام کر سنو!

زیور چھن گئے، شہزادیوں کو فکر نہ ہوئی، اسباب لٹ گیا، شہزادیوں نے اثر نہ لیا مگر جب سروں کی چادریں چھننے لگیں تو ہر بی بی اپنی چادر سے لپٹ جاتی تھی اور جب اس طرح بھی چادریں نہ بچیں تو روایت میں ہے کہ ایک بی بی دوسری کی پیٹھ کے پیچھے چھپ کر پردہ کرتی تھی۔

اسی عالم میں لرزتا ہوا آفتاب گوشۂ مغرب میں چھپ گیا اور مقتل میں شام غریباں کی سیاہی پھیلی۔ میرے سوائے اور میرے گردوپیش تاروں کے سوا کوئی بے کسوں کو روشنی پہنچانے والا نہ تھا۔ کیا اچھی منظرکشی کی ہے نواب تراب یار جنگ نے۔ میری نظر میں آج ہرے بھرے گھر میں رہنے والوں کا یہی عالم ہوگا۔ نواب تراب یار جنگ فرماتے ہیں:

آج ہے شام غریباں، کربلا نظروں میں ہے
رو رہا ہوں آج میں اپنا بھرا گھر دیکھ کر

سنو! سنو! حسینؑ کی لاش کے سرہانے شمع نہ تھی، بہن کے گھر میں چراغ نہ تھا۔ حسینؑ کے واسطے کفن نہ تھا، بہن کے سر پر چادر نہ تھی۔ حسینؑ کا جسم زخموں سے چور تھا، بہن کا جسم تازیانوں سے نیلا تھا۔ اُدھر بھی بے کسی تھی، یہاں بھی حسرت و یاس تھی۔ بس یہی عالم تھا جو ہماری مجلس کا ہے۔ نہ فرش تھا، نہ روشنی تھی، نہ سایہ تھا، نہ کوئی محافظ تھا۔ سب پابرہنہ، سب سر برہنہ مگر عزادارو! وہ بچے جو باپ سے پانی مانگ رہے تھے، بھائی سے پیاس کی شکایت کررہے تھے، پھوپھی کی چادر تھام کر پیاس کا شکوہ کررہے تھے اب کسی کی زبان پر پانی کا نام نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب سب بے ہوش تھے۔

کسی کو ہوش ہی نہ تھا کہ اب پانی کی آواز کوئی سنتا۔ تمام مسلمان مجھ کو یہ بتادیں کہ حسینؑ کے خیموں میں اب بھی پانی پہنچا یا کہ نہیں؟ کسی نے حسینؑ کی شہادت کے بعد پانی پیا یا نہیں؟ بخدا کوئی روایت نہیں بتاتی۔ کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں۔ ہاں کچھ ذاکر پڑھتے ہیں۔ بعض کتابوں میں بھی موجود ہے۔ میں کیونکر کہہ دوں کہ سب جھوٹے تھے۔ سب نے بہتان لگایا۔ اس لئے عرض کرتا ہوں۔ رات ہونے کے بعد عمر سعد نے حر کی زوجہ کو بلایا۔ لے یہ روٹی اور پانی کی مشکیں۔ لے جا اور حسینؑ کے اہل وعیال کو دے دے۔ چند آدمی شمعیں لئے ہوئے چند ٹوکرے روٹیوں کے چند مشکیں پانی کی زوجہ حر لے کر چلی۔

جناب زینبؑ نے دور سے روشنی دیکھی۔ گھبرا کے کھڑی ہوگئیں۔ بہ آواز بلند فرمایا ہمارے ستانے والو! بس اب اس وقت تو رحم کرو۔ ہمارے بچے بے ہوش پڑے ہیں۔ ہم کہیں بھاگ نہ جائیں گے۔ صبح کو جس قدر چاہنا پھر لوٹ لینا۔ یہ آواز سن کر زوجہ حر نے جواب دیا بی بی میں دشمن نہیں ہوں۔ حر کی زوجہ ہوں۔ کھانا پانی لائی ہوں۔ یہ کہتی ہوئی زوجہ حر قریب آئی۔ پہلے پُرسا دیا۔ پھر کھانا پانی پیش کیا۔ مجھ کو تو یقین ہے کہ بچے بے ہوش پڑے ہوں گے۔ جناب زینبؑ نے سکینہ کے منھ پر پانی چھڑکا ہوگا۔ ممکن ہے کہ چند قطرے ٹپکائے بھی ہوں۔

تصانیف

یہ بات قابل بحث نہیں کہ جناب عمدۃ العلماء نے قوم میں شہرت بحیثیت خطیب کے حاصل کی، بحیثیت

صاحب قلم کے نہیں۔ اس کے علاوہ خود سرکار ممدوح نے بھی اپنے کو اس میدان کے شہسواروں میں کبھی محسوب نہیں فرمایا مگر کبھی کبھی جو چیزیں ممدوح کے قلم سے نکل گئی ہیں ان سے آپ کے زور قلم کا کافی اندازہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ آپ جناب غفران مآبؒ کے امام باڑے کی مجلسوں کے لئے بڑے انہماک سے ہر سال کسی ایک آیت کو عنوان بیان قرار دے کر جو مسودے تیار فرمائے تھے اور اس کے لئے ماہ صیام یا شوال کے بعد سے تقریباً دو تین مہینے اس سرگرمی سے مصروف رہتے تھے کہ اس زمانے میں باہر کے وعدے بھی کم فرماتے تھے اور محرم کے قریبی زمانہ میں تو لوگوں سے ملاقات میں بھی بہت کمی فرماتے تھے۔ ان میں سے ہر سال کے مسودوں کے مجموعے کو بلا تکلف ایک کتاب سمجھا جا سکتا ہے اور اس طرح جناب مرحوم کو ہم ایک حد تک کثیر التصانیف اہل قلم میں محسوب کر سکتے ہیں۔

ایک عربی رسالہ نجف اشرف میں لکھ کر فقہاء کے سامنے پیش کیا تھا۔ نیز بعض کتابیں فائدۂ عوام کے لئے آپ کے قلم سے شائع ہوئیں۔ ان سب کی تفصیل ہر سال کے مسودوں کی کتابوں کے صفحات کی تعداد کے ساتھ درج ذیل ہے:۔

(۱) رِسَالَۃٌ فِیْ مُنْجِزَاتِ الْمَرِیْضِ (عربی، تصنیف)
(۲) ہدایۃ العوام حصہ اول در اصول دین۔
(۳) ہدایۃ العوام حصہ دوم (فقہ کتاب الطہارت)
(۴) مجموعۂ مسودات زمانۂ آغاز ذاکری (از ۱۳۳۶ھ تا ۱۳۳۹ھ) جلد اول، صفحات ۱۲۶
(۵) جلد دوم، صفحات ۱۶۸
(۶) جلد سوم، صفحات ۱۱۰
(۷) جلد چہارم، ۳۲
(۸) جلد پنجم، ۹۲
(۹) مسودات مجالس محرم ۱۳۴۰ھ، صفحات ۸۰
(۱۰) مسودات مجالس محرم ۱۳۴۱ھ، صفحات ۹۲
(۱۱) مسودات مجالس محرم ۱۳۴۴ھ، صفحات ۱۶۸

درمیان کے مسودات کی چند جلدیں لکھی گئی تھیں مگر کوئی صاحب لے گئے، انھوں نے قبضہ کر لیا اور وہ مسودے اپنا لیئے۔ اس لئے وہ فہرست سے خارج کر دیئے گئے۔

(۱۲) مسودات مجالس محرم ۱۳۴۸ھ، صفحات ۸۲
(۱۳) مسودات مجالس محرم ۱۳۴۹ھ، صفحات ۴۲

چونکہ ۷؍ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ کو جناب قدوۃ العلماء کا انتقال ہوا تھا اور اس کے بعد طویل سلسلہ تفکرات کا شروع ہو گیا۔ اس لئے اس سال مکمل مسودات لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کا تذکرہ پہلے مسودہ میں موجود ہے۔

(۱۴) مسودات مجالس محرم ۱۳۵۰ھ، صفحات ۱۴۶
(۱۵) مسودات مجالس محرم ۱۳۵۱ھ، صفحات ۹۲
(۱۶) مسودات مجالس محرم ۱۳۵۲ھ، صفحات ۸۲
(۱۷) مسودات مجالس محرم ۱۳۵۴ھ، صفحات ۱۰۶
(۱۸) مسودات مجالس محرم ۱۳۵۵ھ، صفحات ۱۱۲
(۱۹) مسودات مجالس محرم ۱۳۵۶ھ، صفحات ۵۸

(۲۰) مسودات مجالس محرم ۱۳۵۷ھ، صفحات ۸۸
(۲۱) مسودات مجالس محرم ۱۳۵۸ھ، صفحات ۹۸
(۲۲) مسودات مجالس محرم ۱۳۵۹ھ، صفحات ۹۶
(۲۳) مسودات مجالس محرم ۱۳۶۰ھ، صفحات ۱۲۲
(۲۴) مسودات مجالس محرم ۱۳۶۱ھ، صفحات ۱۱۴
(۲۵) مسودات مجالس محرم ۱۳۶۲ھ، صفحات ۲۷
(۲۶) مسودات مجالس محرم ۱۳۶۳ھ، صفحات ۸۸
(۲۷) مسودات مجالس محرم ۱۳۶۴ھ، صفحات ۱۱۲

درمیان کے ایک سال کے مسودوں کی جلد موجود نہیں ہے۔

(۲۸) مسودات مجالس محرم ۱۳۶۶ھ، صفحات ۶۴
(۲۹) مسودات مجالس محرم ۱۳۶۷ھ، صفحات ۱۴۶
(۳۰) مسودات مجالس محرم ۱۳۶۸ھ، صفحات ۱۵۰
(۳۱) مسودات مجالس محرم ۱۳۶۹ھ، صفحات ۱۶۰

ایک جلد پھر غائب ہے۔

(۳۲) مسودات مجالس محرم ۱۳۷۱ھ، صفحات ۳۲
(۳۳) مسودات مجالس محرم ۱۳۷۲ھ، صفحات ۸۸

ایک سال کے مسودے پھر موجود نہیں ہیں۔

(۳۴) مسودات مجالس محرم ۱۳۷۴ھ، صفحات ۱۱۲
(۳۵) مسودات مجالس محرم ۱۳۷۵ھ، صفحات ۱۲۶
(۳۶) مسودات مجالس محرم ۱۳۷۶ھ، صفحات ۱۵۲
(۳۷) مسودات مجالس محرم ۱۳۷۷ھ، صفحات ۶۴
(۳۸) مجلس ردخیالات الفرڈ گلوم ۱۳۷۸ھ، صفحات ۱۳

اس کے بعد ضعف بصارت کی وجہ سے آپ کئی سال مسودات تحریر نہیں فرما سکے۔

یہ ۳۵ سال کے جو مسودات موجود ہیں ان میں تقریباً ہر دینی اور اجتماعی موضوع پر بیش بہا تبصرہ موجود ہے۔ اگر جناب مرحوم کے اخلاف یا معتقدین میں سے کوئی اتنی زحمت اٹھائے کہ ان مسودات میں سے ہر موضوع پر جتنا ہے۔۔۔۔ربط مصائب وغیرہ کی ضرورت سے جو اضافے ہیں ان سے خالی کر کے مرتب شکل میں لکھ دے تو کثیر التعداد تصانیف جناب مرحوم کے متعدد موضوعات پر معرض ظہور میں آسکتے ہیں جن سے ہر ذوق کے لوگ بیش قرار فوائد حاصل کر سکتے ہیں اور امامیہ مشن لکھنؤ اپنے مالی حالات کی وجہ سے اگر چھوٹے رسائل ہی کے شائع کرنے پر تیار ہو تو امامیہ مشن پاکستان یقیناً اس کے لئے تیار ہوگا کہ وہ ان ضخیم کتابوں کو جو اس طرح تیار ہوں شائع کر کے اپنے پنج سالہ منصوبہ کے تحت میں ایک اہم کارنامہ انجام دے دے۔

(۳۹) پردہ کے موضوع پر جناب مرحوم کے بیانات کی بڑی امتیازی شہرت تھی اور اس سلسلہ میں ممدوح نے جو کچھ تحریر فرمایا تھا اسے خود مسلسل ایک بسیط مقالہ کی صورت میں مرتب فرما دیا تھا جو مسلسل اخبار ''نظارہ'' لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اگر نظارہ کا یہ فائل کہیں محفوظ ہو تو پردہ کے موضوع پر کتابی شکل میں اس کو شائع کر دیا جائے۔

(۴۰) سفرنامۂ عراق وایران بھی جو مسلسل روزنامۂ ''حق'' لکھنؤ میں شائع ہوا تھا اور ایک بڑا حصہ اس کا پیام اسلام میں بھی شائع ہوا خاصی مفید کتاب ہے۔

اس کے علاوہ متفرق قومی تحریکات کے سلسلہ میں

جو اپیلیں ہیں۔ شیعہ کانفرنس کے دو سالانہ اجلاسوں کے خطبہ ہائے صدارت ہیں۔ قضیۂ شہید انسانیت میں کوشش مصالحت کی روئداد ہے۔

ان تمام چیزوں کو بھی یکجا کر کے شائع کر دینا چاہئے اور اگر ادباء و شعراء اور قومی لیڈروں کی یادگار کے طور پر ان کے خطوط محفوظ کئے جاتے ہیں تو علمائے اعلام کے لئے بھی اسے "بِدْعَتِ سَیِّئَہ" کیوں سمجھا جائے اور اس کی ابتداء بھی جناب عمدۃ العلماء ہی سے کیوں نہ کی جائے کہ آپ کے خطوط کو بھی یکجا کرنے کی کوشش کی جائے۔ غرض وقتی مظاہرات جس طرح آپ کی وفات کے سلسلہ میں بے مثال صورت پر ہوئے ہیں، اسی طرح ضرورت ہے کہ اب آپ کی ٹھوس اور پائدار یادگاروں کے قیام کی طرف توجہ کی جائے۔

زیارت مشاہد

جہاں تک ہمیں معلوم ہے مشاہد مشرفہ کی طرف آپ کا وہ پہلا سفر تھا جو بغرض تکمیل علوم تھا اور جس میں آپ نے کربلائے معلّٰی میں پہلی بیوی کے انتقال کے بعد موجودہ اہلیۂ محترمہ کے ساتھ عقد فرمایا۔

دوبارہ آپ نے ۱۹۵۳ء میں عتبات عالیات کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور اس سفر کے حالات روزنامچہ کی صورت میں تحریر فرمائے جس کا ذکر تصانیف کے ذیل میں ہو چکا ہے۔

عوارض و امراض

جناب عمدۃ العلماء طاب ثراہ ابتدائے عمر سے ورزش کے عادی تھے۔ جسم بہت خوبصورت اور کسرتی تھا مگر ابتدائی طالب علمی کا دور ختم ہونے کے بعد غالباً سفر عراق کے بعد سے ورزش ترک ہوگئی۔ ممکن ہے آپ کی خرابی صحت کا ابتدائی سبب یہی ہو۔ چنانچہ جناب مرحوم سے میل جول رکھنے والے ہر آدمی کو اس کا علم ہوگا کہ عرصۂ دراز سے آپ کی غذا صرف ایک وقت کی رہ گئی تھی۔ شام کو صرف چائے پر اکتفا فرماتے تھے اور اکثر آپ کی زبان سے یہ سنا گیا کہ میرے فم معدہ پر ورم ہے۔ اس کی وجہ سے ذرا سی بھی بے اعتدالی بہت تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ ادھر چند سال سے شاید معدہ ہی کے بخارات کی وجہ سے کئی مرتبہ قلبی دورے پڑے تھے جس کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں کسی دن یہی قلبی دورہ آپ کی زندگی کے لئے خطرہ نہ بن جائے مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا اور دل نے آپ کا آخر وقت تک ساتھ دیا لیکن وہی معدہ کا ورم جان لیوا ثابت ہوا۔

مرزا کوکب قدر صاحب نے لکھا ہے کہ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں سینہ کے مقام پر کوئی چیز رکتی محسوس ہوتی تھی۔ معدے کی خرابی تجویز کی گئی۔ خود سرکار عمدۃ العلماء نے اپنے اس مکتوب میں جو عنقریب پورا درج ہوگا یکم جولائی ۱۹۶۳ء کو تحریر فرمایا ہے کہ "سات آٹھ ماہ سے یہ نئی صورت پیدا ہوئی کہ لقمہ گلوگیر ہونے لگا۔

ماہ مبارک رمضان میں عموماً جناب مغفور پر روزہ کا اثر بہت ہوتا تھا مگر چونکہ بظاہر کوئی خاص مرض ان روزوں سے پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے آپ روزے برابر رکھتے تھے۔

زندگی کے آخری ماہ رمضان ۱۳۸۲ھ میں جو

روزوں میں تکلیف بڑھی تو اسے بھی آپ نے کوئی خاص اہمیت نہ دی اور حسب معمول روزے رکھے چنانچہ عید کے دن تک بھی کسی خاص مرض کا احساس نہ تھا۔ آپ نے نماز عیدین اور خطبہ وغیرہ تمام فرائض انجام دیئے مگر عید کے بعد بھی جب تکلیف باقی رہی اور یہ محسوس ہوا کہ غذا کے معدہ تک پہنچنے میں دشواری ہوتی ہے تو اس کے بعد ڈاکٹروں کی طرف رجوع کی گئی اور جناب مرحوم کو تو نہیں بتلایا گیا مگر ڈاکٹروں نے بصیغۂ راز آپ کے صاحبزادگان سے کینسر کا شبہ ظاہر کیا جس کی بنا پر چھوٹے صاحبزادے جناب مولانا سید کلب صادق صاحب کے اصرار سے جناب نے بمبئی کا سفر اختیار فرمایا۔ بس اس وقت سے عموماً شہر اور بیرون شہر میں آپ کی ناسازئ مزاج اور صورتِ حال کی نزاکت کا لوگوں کو علم اور ''کینسر'' کے ہولناک نتیجہ کا سب کو تصور پیدا ہوگیا اور بے چینی کے ساتھ دعائیں کی جانے لگیں پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ تیمارداروں کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ جناب مرحوم سے اس چیز کو آخر تک صیغۂ راز میں رکھا اور ڈاکٹروں کی تشخیص اور لوگوں کے عام تصور کا جناب مرحوم کو کوئی علم نہیں ہونے پایا۔ بمبئی میں چند روزہ قیام کے اندر جناب مرحوم کی قوت میں انحطاط شروع ہوا اور لکھنؤ میں آنے کے بعد جب ہومیوپیتھک علاج شروع ہوا اور یہ کیفیت پیدا ہوگئی کہ معدہ میں اب کوئی چیز ٹھہرتی ہی نہ تھی تو پھر تو قوت میں روز بروز کمی ہوتی گئی اور بظاہر اسباب آخر یہی چیز جان لیوا ثابت ہوئی۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے بمبئی روانہ ہونے کے وقت ہی سے عام طور پر لوگوں کو مغفور کی صحت کی طرف سے شدید مایوسی ہوگئی تھی اور آپ کے مرض کے مہلک ہونے کا احساس تھا اس لئے دریافت خیریت کے لئے عموماً خطوط صاحبزادگان کے نام روانہ کئے جاتے تھے مگر کافی عرصہ تک جناب مرحوم نے یہ التزام رکھا کہ خیریت دریافت کرنے والوں کا جواب خود تحریر فرماتے تھے اور اس میں وہ خود اپنے خیالات مرض تحریر فرماتے تھے۔

اس سلسلہ کا سب سے بسیط خط غالباً وہ ہے جو آپ نے جناب مولانا مرزا یوسف حسین صاحب صدرالافاضل، واعظ مدرسۃ الواعظین کو جو اصلاً لکھنوی ہیں اور بادل ناخواستہ جبراً پاکستانی ہوگئے، تحریر فرمایا تھا اور ضمناً یہ فرمائش کی تھی کہ آپ اس کو اخباروں میں شائع فرما دیجئے چنانچہ ممدوح کی طرف سے اخبار ''درِّ نجف'' سیالکوٹ کی اشاعت ۲۴ر جون و یکم جولائی ۱۹۶۳ء میں یہ خط درج کیا گیا ہے۔ یہ مکتوب گرامی حسب ذیل ہے:

دَامَ اِجلالُکُمُ العَالِی

تسلیم۔ گرامی نامہ وصول ہوکر سبب تشکر ہوا۔ خداوند عالم آپ کو صحت و عافیت سے رکھے۔

میری حالت یہ ہے کہ میرے معدہ کی خرابیاں تو اتنی پرانی ہیں کہ تاریخ کیسی، ابتداء مرض کا سنہ بھی نہیں بتا سکتا۔ مگر نہ مجھ کو کھانے پینے میں دقت تھی، نہ کمزوری، نہ قوت میں کمی مگر سات آٹھ ماہ سے یہ نئی صورت پیدا ہوئی کہ لقمہ گلوگیر ہونے لگا۔ پہلے تو میں نے کوئی توجہ نہیں کی مگر جب زیادتی ہوئی تو اب علاج شروع کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تاہم اتنا مرض زائد بھی نہ ہوا تھا کہ میں روزہ نہ رکھ سکتا۔ کسی نہ کسی

صورت سے افطار بھی کرتا رہا اور سحری بھی کھاتا رہا۔ مگر عید کے بعد سے تکلیف بڑھنا شروع ہوئی۔ آخر میں نے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ سب کی رائے ہوئی کہ ایکسرے کرالو میں نے ایکسرے کرائے تو بس اتنا معلوم ہوا کہ فم معدہ سے چار انگل اوپر کچھ خرابی ہے مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کیا ہے سب کی رائے ہوئی کہ بمبئی جا کر تحقیق کرالو بمبئی گیا۔ وہاں کے چار سربرآوردہ ڈاکٹروں کو دکھایا۔ کئی ایکسرے کئے گئے۔ سب کی رائے ہوئی کہ فم معدہ سے چار انگل اوپر ورم ہے۔ پندرہ سولہ دن علاج کرتا رہا مگر کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ آخر لکھنؤ واپس آیا۔ یہاں بدقسمتی سے رائے ہوئی کہ ہومیو پیتھک علاج کروں۔ سولہ دن علاج کرتا رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا جو آج تک قائم ہے کہ پانی تک معدہ میں نہیں اُترتا۔ بمشکل تھوڑا پانی پی کر قے کرتا ہوں جب کچھ رطوبات حلق اور معدہ سے کم ہوتے ہیں اور چند گھونٹ پانی پیتا ہوں۔ جب رطوبات صاف ہو کر منھ سے نکل جاتے ہیں تو دوا یا چائے یا یخنی وغیرہ پیتا ہوں۔ وہ بھی کچھ تھوڑی نکل جاتی ہے، کچھ معدہ میں تھم جاتی ہے۔ رقیق چیزیں بھی ہر وقت معدہ تک نہیں پہنچتیں۔ اب کچھ یونانی علاج کر رہا ہوں۔ ہومیو پیتھک نے مار اتارا۔ اب فرق آ گیا ہے ممکن ہے کہ آئندہ کمی بھی ہو۔ کمزوری بہت بڑھ گئی ہے۔ دعا فرمائیں۔

اکثر اہل پاکستان حالات کی تفصیل چاہتے ہیں اگر جناب یہ تمام تفصیل میرے حالات کی نقل کر کے اخبارات کو دے دیں تو بڑی مرحمت ہوگی۔

السید کلب حسین نقوی ۲۴ رمئی ۱۹۶۳ء

جیسا کہ سرکار مرحوم نے اپنے مکتوب بالا میں تحریر فرمایا ہے بمبئی سے واپسی کے بعد پہلا علاج جو ہومیو پیتھک ہوا ظاہری طور پر اس کے اثرات آخر تک قائم رہے اور وہی سبب ہلاکت ہوئے۔

شفاء الملک حکیم عبدالمعید صاحب (جھنوائی ٹولہ، لکھنؤ) نے بڑی تندہی سے تقریباً ۶ مہینے علاج کیا جس میں یہ حقیقت ہے کہ اپنے کمال فن کا پورا پورا ثبوت دیا چنانچہ معدہ سے چار انگل اوپر والا ورم تقریباً ختم ہو گیا اور غذا کا درمیان میں رکنا موقوف ہو گیا مگر بدنصیبی سے معدہ میں پہنچ کر غذا کا واپس ہونا جو اس ہومیو پیتھک علاج میں پیدا ہوا تھا وہ ختم نہیں ہوا۔

انتقال سے چند ہفتے پہلے حکیم صاحب کا علاج ترک ہو گیا تھا اور ڈاکٹر عبدالحلیم صاحب کا بالانفراد اور آخر میں کسی دوسرے ڈاکٹر کی شرکت کے ساتھ علاج ہوا جس کے بعد قضائے الٰہی جو تھی وہ جاری ہوئی۔

چونکہ ڈاکٹروں کی تقریباً متفقہ تشخیص یہی تھی اس لئے بعد میں ہر ایک اخبار میں اور ہر سوانح نگار کے قلم سے یہی نظر آتا ہے کہ کینسر کا موذی مرض تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ کینسر کے جو خاص کیفیات آخر میں ہوتے ہیں وہ جناب مرحوم میں کسی وقت پیدا نہیں ہوئے اور آپ کی آواز وغیرہ پر ایک لحہ کے لئے بھی مرض کا اثر نہیں ہوا۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اول و آخر وہی فم معدہ کا ورم تھا جو طبی حیثیت سے اب شاید کینسر ہی کہلائے۔ وہی آپ کی عمر بھر کی بیماری تھی اور اسی نے آخر زندگی کا خاتمہ کیا۔

وصیت نامہ

جناب مرحوم نے وفات سے چھ سال قبل ایک وصیت نامہ تحریر فرمایا تھا جس کے آخر میں دستخط کے ساتھ تاریخ ۱۴ر شعبان ۱۳۷۷ھ مطابق ۶ر مارچ ۱۹۵۸ء یوم پنجشنبہ درج ہے۔ یہ پورا وصیت نامہ تو ہماری نظر سے گذرا نہیں مگر اس کے جستہ جستہ اقتباسات مرزا کوکب قدر صاحب نے درج کئے ہیں اور ان پر کچھ تبصرہ بھی کیا ہے مثلاً:۔

''جس وقت سے میں نے ہوش سنبھالا اس وقت سے اس وقت تک میں اپنے ماں باپ کو کبھی نہیں بھولا اور ہر روز بلاناغہ کچھ نہ کچھ ہدیۂ ثواب مین ان کی خدمت میں ضرور پیش کیا ہے لہٰذا میں تمام اہل وعیال سے وصیت کرتا ہوں کہ مجھے بھی کبھی فراموش نہ کریں۔''

یہ ایک عالم باعمل کے الفاظ ہیں اور اس لئے وزن رکھتے ہیں کہ لکھنے والے نے تقریباً ساٹھ برس ماں اور پینتیس برس باپ کو ہر روز بلاناغہ یاد کیا۔ غیر شہروں کے رہنے والے واقف نہیں کہ سرکار مرحوم آخری دفعہ امام باڑے کب گئے تھے۔

''گیارہ ربیع الثانی قدوۃ العلماء کے دیسے کا دن تھا۔ دیسے کی یہ مجلس پڑھتے تو کوئی اور صاحب تھے۔ سرکار مرحوم فرش بچھوانے اور مہمانوں کے آرام کا انتظام کرنے میں اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ اس دفعہ کمزوری کے سبب اپنے پیروں سے جانے کی طاقت نہ تھی۔ فینس پر تشریف لے گئے اور قبر پر فاتحہ پڑھ کے جو واپس آئے ہیں تو پھر زندہ اس امام باڑے میں داخل ہونا نصیب نہ ہوا۔''

جناب صفوۃ العلماء مدظلہ کی جانشینی کے سلسلہ میں حسب ذیل اقتباس ''عکس تحریر'' کی صورت میں ہے:۔

''جن اوقاف کی تولیت میرے متعلق ہے وہ سب میں نور چشم عابد صاحب سلمہٗ کے سپرد کرتا ہوں اور نماز جمعہ بھی نور چشم مذکور کے حوالہ کرتا ہوں۔ اگر نور چشم صادق سلمہٗ اپنے بھائی کی انتظامات خانہ واوقاف میں مدد کریں تو میری روح کے واسطے بہت مسرّت کا باعث ہوگا۔''

وفات حسرت آیات

دعائیں اتنی ہوئیں جتنا تصور بھی مشکل ہے۔ دواؤں میں بھی کوئی کمی نہیں ہوئی مگر قلم قضائے الٰہی چل چکا تھا۔ آخر ۱۷ر جمادی الاول ۱۳۸۳ھ ۶ر اکتوبر ۱۹۶۳ء بروز یکشنبہ ۷۱ برس شمسی اور ۷۲ برس قمری حساب سے عمر پاکر صبح کو ۸ بج کر دس منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہا۔

جیسا کہ کوکب قدر صاحب نے لکھا ہے:

''ظہر کے وقت لکھنؤ ریڈیو نے منادی کی کہ مولانا کلب حسین نے آج داعی اجل کو لبیک کہا۔ سفر آخرت کی تیاریاں ہیں۔ بوقت مغرب نماز جنازہ کے لئے صفیں بھی درست نہ ہوئی تھیں کہ دلّی ریڈیو ہر ہر زبان میں اس کی گونج چاردانگ عالم میں پھیلا چکا تھا۔''

جنازہ اٹھنے کے حالات موصوف نے کافی تفصیل سے اور مؤثر انداز میں اس طرح لکھے ہیں کہ:۔

''میت انتقال کے بعد ہی شریعت کدہ کے زنانہ حصہ میں پہنچادی گئی تھی لیکن یہاں اگر مرد نہ آسکتے تھے تو

عورتیں ضرور آسکتی تھیں۔ گریۂ وبکا کا شور صبح آٹھ بجے سے چار بجے تک ایک لمحہ کے لئے نہ رکا اور جب میت اٹھنے کا وقت آیا تو اندر باہر وہ کہرام تھا کہ جس کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں......اندرون خانہ سے میت علماء واعزا نے اٹھائی۔ شریعت کدہ کے دروازے بند تھے۔ تابوت کا ایک دفعہ باہر نکلنا تھا کہ پھر کسی کا اختیار نہ رہا............

نقیب کے لئے لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کیا گیا تھا لیکن کہرام کا وہ عالم تھا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز چند قدم سے آگے نہ بڑھتی تھی۔ جنازے کندھوں پر اٹھائے جاتے ہیں......لیکن ہجوم کا وہ عالم تھا کہ جنازہ ہاتھوں ہاتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ سیاہ پوشش تنگ گلی میں تار تار ہوگئی۔ بڑی سڑک تک پہنچتے پہنچتے اگر رضا کار، انتظام نہ کرتے تو زربفت کی چادر بھی ختم ہوجاتی۔ وکٹوریہ اسٹریٹ پر آگے آگے لکھنؤ کی ماتمی انجمنوں کے کوئی تیس علم تھے۔ جلو میں سوگواروں کا مجمع تھا............

شاہ مینا سے آگے بڑھ کر سلطان المدارس کا دروازہ دکھائی دیا تو وہ زمانہ یاد آیا جب ایک طفل خرد سال مستقبل کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور پھر منظر بدلا تو وہی مرد ضعیف کی صورت میں بستر مرگ پر پڑا سرکار نصیر الملت سے یہ اصرار کہتا سنائی دیا کہ "میرے سینہ پر ہاتھ رکھیئے اور قسم کھایئے کہ سلطان المدارس کو یہاں سے کہیں اور نہ لے جائیں گے۔"

رات کے کوئی ۹ بجے کمپنی باغ میں آقائے شریعت (صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ) نے نماز جنازہ پڑھائی............

کمپنی باغ سے امام باڑہ کچھ دور نہیں لیکن جلوس نے یہ مسافت کوئی دو گھنٹے میں طے کی کیونکہ دن کے وقت جتنا مجمع تھا رات کے وقت اس سے دوگنا بڑھ چکا تھا۔ اور مکانات کی چھتیں سوگواروں سے پٹی پڑی تھیں۔ امام باڑے میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی............

جنازہ اندر صحن میں پہنچا تو علمہائے مبارک نے جنازے کو اپنے سایہ میں لے لیا اور انہی علموں کے سائے میں میت سپرد خاک کی گئی۔"

اخبار سرفراز لکھنؤ کے ۹/اکتوبر ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں ہے:

"آپ کے جنازہ کے ساتھ شیعہ ہی نہیں بلکہ علمائے فرنگی محل، جناب شاہد مینائی صاحب سجادہ نشین مزار شاہ مینا اور دوسرے سنی حضرات کثیر تعداد میں شامل تھے۔ اسی طرح ہندو بھی جلوس جنازہ میں شریک تھے مثلاً سابق وزیر اعلیٰ سی۔ پی۔ گپتا، سابق وزیر صحت بابو مہابیر پرشاد، ڈاکٹر پی۔ ڈی۔ کپور میئر لکھنؤ کارپوریشن، کیپٹن وی۔ آر۔ موہن، ڈپٹی میئر ایم۔ ایل سی۔ برجا سوشلسٹ لیڈر بابو ترلوکی سنگھ، ڈاکٹر وی۔ بی۔ پانڈے فزیشین، ڈاکٹر بی۔ اے۔ شرما اور ڈاکٹر چرن......"

یہ امر متفق علیہ ہے کہ جناب عمدۃ العلماء کے غم کا جو ہمہ گیر اور دیرپا اثر ہوا اس کی مثال اس کے پہلے کم از کم موجودہ نسل (جس میں اس وقت کے زیادہ سے زیادہ سن رسیدہ بزرگان بھی داخل ہیں) کی یاد میں نہیں ہے جسے "قدرتی امر" کہنے کے سوا اس کی کوئی عقلی اور منطقی توجیہ قطعاً

ممکن نہیں ہے۔

قطعات تاریخ

قطعات تاریخ مجالس میں اس کثرت سے پڑھے گئے ہیں کہ ان کی صحیح تعداد نہیں بتائی جاسکتی۔ اس کے علاوہ مختلف اخباروں میں شائع ہوئے۔ پھر بہت سا حصہ ان کا ایسا ہوگا جو نہ کہیں پڑھا گیا اور نہ کہیں شائع ہوا۔ مگر جو قطعات خود ہماری نظر سے اخباروں میں گذرے ہیں وہ بھی بکثرت ہیں۔ ان میں حسب ذیل تاریخیں جو ہمارے نزدیک کسی خاص ندرت یا حسن کی حامل ہیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) جناب عماد العلماء مولانا سید محمد رضی صاحب سعیدؔ آل نجم العلماء و نبیرۂ عماد العلماء جناب میر آغا صاحب قبلہ۔ آپ جناب عمدۃ العلماء طاب ثراہ کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں اور سب سے بڑے داماد بھی۔ آپ کا قطعۂ تاریخ کافی طولانی ہے جو ہندوستان و پاکستان کے اخباروں میں شائع ہوا ہے۔ اس کے جستہ جستہ کچھ اشعار حسب ذیل ہیں:

لٹ گئی دولت چمن کی آگیا دور خزاں
اٹھ گیا محفل سے وہ جو دہر میں تھا انتخاب
جس نے ڈالی طرح نو گفتار کے انداز میں
جس کی اک اک لفظ اعجاز فصاحت کا شباب
جس کے انداز بیاں کی ہر طرف اک دھوم ہے
جس کے طرز فکر کا ملتا نہیں کوئی جواب



آصفی مسجد جسے روتی رہے گی حشر تک
وہ امام جمعہ جو تربت میں ہے اب محو خواب
ذاکر شام غریباں حضرت کلب حسین
عابد شب زندہ دار وعارف روز حساب



رات کے تاریک سناٹوں میں اور پچھلے پہر
سجدہ گاہیں ڈھونڈھتی ہیں جس کے سجدوں کا شباب
بجھ گئی وہ شمع پروانے اکیلے رہ گئے
کروٹیں لیتی ہے دنیا اور تو ہے محو خواب



لکھنؤ کی وہ زمیں تو نے چنی اپنے لئے
خاک میں جس کی ترے اجداد ہیں سب محوِ خواب
وادی ایمن کا ہم رتبہ وہ خطہ ارض کا
جس کے ہر ذرّہ میں پنہاں ہیں ہزاروں ماہتاب
وہ جگہ سوتے ہیں جس میں حضرت غفراں مآبؒ
وہ حسینیہ جہاں مدفون ہیں رضواں مآبؒ
دفن جب ہونے لگا تو بھی وہاں کی خاک میں
آسماں نے دی صدا یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابْ
جب جنازہ قبر پر پہنچا تو ہاتف نے کہا
یہ امانت آگئی ہے آپ کی غفراں مآبؒ
۳ ۶ ۳ ۱ ھ

(مادّہ تاریخ میں الف ممدودہ کے ہر جگہ دو عدد لئے گئے ہیں)

(۲) ارشد تلامذۂ خاندان دبیرؔ جناب سید سرفراز حسین صاحب خبیرؔ لکھنوی

واقف نہیں ہے کون کہ ہندوستاں میں تھے
غفراں مآبؒ سید وسلطانِ اجتہاد
کانٹوں سے صاف کرکے بیابان علم کو
پیراستہ کیا چمنستانِ اجتہاد
آئے خزاں کے دور، مخالف ہوائیں بھی
کھلتے رہے مگر گل وریحان اجتہاد
اس عہد میں تھے ملت بیضا کے رہنما
کلب حسین شمعِ شبستان اجتہاد
سترھویں تھی جمادی الاول کی آہ آہ
دنیا سے چل بسا وہ دل و جانِ اجتہاد
یکشنبہ کو بوقت سحر حشر ہوگیا
تھا غم کدہ بنا ہوا ایوانِ اجتہاد
افسوس ہم سے چھین لیا اس کو موت نے
قائم تھی جس سے منزلت وشانِ اجتہاد
ہے جمعہ کا نہ لطف نہ مجلس کا وہ ہے رنگ
بے تیرے اے خطیبِ گل افشانِ اجتہاد
محراب پوچھتی ہے مصلّے سے تو بتا
ہے کس جگہ وہ رونقِ ایوانِ اجتہاد
تیرے بغیر شامِ غریباں کی مجلس آج
گویا ہے بزمِ شام غریبانِ اجتہاد
ہیں آبروئے قوم ترے دونوں خوش گہر
بحر علوم کے در ومرجانِ اجتہاد
یا رب ہو سیر گلشن رجعت انھیں نصیب
غیبت میں ہیں یہ سروِ خرامانِ اجتہاد
وقت ظہور چوم کے پائے امام عصرؑ
مسند کے پاس رکھ دیں قلم دانِ اجتہاد
بس اے خبیرؔ مصرعِ تاریخ غم لکھو
ہے وہ خموش بلبل بستانِ اجتہاد
۳ ۶ ۹ ۱ ء

(۳) غم آشوب دل

یہ شاعرِ حسینیت جناب سید محمد اطہر صاحب زائرؔ سیتاپوری منیجر ریاست محمود آباد کا ایک تواریخی کارنامہ ہے جس میں مختلف طرح سے کثیر التعداد تاریخیں ہیں یہاں ان میں سے چند جو منتخب حیثیت رکھتی ہیں درج کی جاتی ہیں:۔

خوں کے اشکوں سے نہ روؤں تو میں کیونکر روؤں
غم وہ ہے اور زیادہ دل ویراں ہے اداس
تیرگی چھائی ہے روشن نہیں سینے کے بھی داغ
شمع دل بجھ گئی کیسی کہ شبستاں ہے اداس
بستر مرگ پہ بیمار نے کروٹ بدلی
چارہ گر کانپ اٹھے تار رگ جاں ہے اداس
آہ وہ منظر غم آہ وہ بوجھل سی فضا
یاد کرنے سے فقط عالم امکاں ہے اُداس
آل غفران مآبؒ آج ہے پھر صرف عزا
اب شریعت کدۂ منزلِ عرفاں ہے اداس
زمزمہ سنج ثنائے شہ مرداں نہ رہا
اک وہ خاموش ہے کیا سارا گلستاں ہے اُداس
وہ بنا شام غریباں کی وہ انداز خطاب
اب نئی شان سے وہ شام غریباں ہے اداس

موجیں ٹکرائیں حوادث کی تو پلٹیں مایوس
مگر اب جائیں کہاں مرکز طوفاں ہے اداس
ولولے چھوڑ گیا سرورؒ دیں کا مدّاح
زندگانی کا مگر اب وہی عنواں ہے اداس
رونق محفل علم اہل نظر کلب حسین
اٹھ گیا قدس کا بلبل چمنستاں ہے اداس
ذاکر آل نبیؐ اوج نوائے منبر
زیب مجلس وہ نہیں، شام غریباں ہے اداس
۱۹۶۳ء — ۱۳۸۳ھ — ۱۳۷۱ف
(مجموعۂ حروف اول ہر مصرعہ اولیٰ عیسوی وحروف آخر ہر مصرعہ اولیٰ ہجری وحروف اول ہر مصرعۂ ثانی فصلی)

لاش پر سایہ فگن ہوگیا دامانِ علم
تالحد جاتے ہیں یوں شاہ شہیداں والے
گونج اٹھی سورۂ رحمن کی عالم میں صدا
دل پہ چھاجاتے ہیں یوں بولتے قرآں والے
ہوگئی عمر تری صرف عزائے شہدا
حق ترا ہے، تجھے کیوں روئیں نہ ایماں والے
نہیں بھولے گی شب یازدہم کی مجلس
ذاکر سبط نبیؐ مسند عرفاں والے
تیری میت جو اٹھی دھوم سے اے کلب حسینؒ
یاد آنے لگے مقتل کے شبستاں والے
ہم جو پہنچا کے سر منزلِ اوّل پلٹے
جمع ہونے لگے جنت کے گلستاں والے
خیر مقدم کو بڑھا اور پکارا رضواں
با وفا! آ ادھر اے شام غریباں والے
۳ ۶ ۹ ۱ ء



قطب عالم، عابد وروح و دلِ غفران مآبؒ
۳ ۶ ۹ ۱ ء
کوہ علم، افقہ، بہ ربط رشتۂ حبل متیں
۲۰ ۲۰ سمت
خوش بیان واہل دل، علامۂ کلب حسین
۱ ۷ ۳ ۱ ف
وجد آراہم صفیر بلبل سدرہ نشیں
۳ ۸ ۳ ۱ ھ



علامۂ عصر، مجتہد، کلب حسین
آن عاشق جاں نثار آل احمد
تاریخ وفات معنوی وصوری
ہجری سہ وہشتاد و ہزار وسہ صد



جذبۂ عشق امام داد عروج کمال
مرحمت لا زوال قرب شہ مشرقین
مصرع سال وفات زائرؔ رنجور گفت
بیت جوار حسین جنت کلب حسین
۳ ۸ ۳ ۱ ھ



ان لوگوں کے جواب میں جنھوں نے جناب مرحوم کی ایصال ثواب کے مجلسوں اور شب بیداری پر نکتہ چینی کی:۔

کرم عام ذکر مولا ہے
۳ ۸ ۳ ۱ ھ
اک غلام حسین کی مجلس
۳ ۸ ۳ ۱ ھ
بے بدل فیض مجلس شبیر
۳ ۸ ۳ ۱ ھ
غم کلب حسین کی مجلس
۳ ۸ ۳ ۱ ھ
جگر سوزی قلم زائر سیتاپوری
۳ ۸ ۳ ۱ ھ



(۴) جناب ظہور حیدر صاحب ظہورؔ جارچوی کے قطعہ کا آخری شعر جس کے دوسرے مصرع میں مادّہ تاریخ ہے:

مصرع ظہورؔ لکھ دو یہ لوح مزار پر
کلب حسین جانب باغ جناں گئے

(۵) سید آفتاب احمد صاحب جعفری پھرسری متخلص بہ ثمرؔ ہوشنگ آبادی کے چند منتخب اشعار مع مادہ تاریخ:۔

اے ثنا خوان علی مرتضیٰ کلب حسین
تجھ سے راضی ہیں محمد اور خدا کلب حسین
دور تک راہ عمل میں تیرے قدموں کے نشاں
دے رہے ہیں تیری منزل کا پتہ کلب حسین
لکھنؤ کی مجلس شام غریباں کی قسم
موت کرسکتی نہیں تجھ کو فنا کلب حسین
اے ثمرؔ تاریخ بن جاتے ہیں خود ان کے صفات
ذاکرِ آلِ علی، جانِ وفا کلب حسین

آخر میں وہ عربی قطعہ تاریخ درج کیا جاتا ہے جو بندہ کا نتیجہ قلم ہے اور جس کا مادۂ تاریخ جناب عمدۃ العلماء کے اسم گرامی کے ساتھ قرآن مجید سے ماخوذ ہونے کی بنا پر ایک خاص ندرت کا حامل ہے:۔

لَمْ يَزَلْ حَافِظًا لِحِمَى الْ
حَقِّ مُجَاهِداً لِكُلِّ الْجُهُوْدِ
نَاشِرًا حَدِيْثَ اَمْرِ حُسَيْنٍ
رَافِعًا بِذِكْرِهٖ لِلْبُنُوْدِ
فِي الْحِجَازِ بَيْنَ الْمَلاَ ئِ تَرَاهُ
هَازِمًا بِبَأسِهٖ لِلْجُنُوْدِ
وَمَضٰى اِلَى الْجِنَانِ فَالْقَىٰ
رِحْلَهُ لَدَى الْحُسَيْنِ الشَّهِيْدِ
ثَاوِيًا بِبَابِهٖ كَالَّذِىْ يَطْرُ
رَدَّ عَنْ حِمَاهُ كُلَّ عَنِيْدِ
قُلْ مُؤَرِّخًا أَكَلْبُ حُسَيْنٍ
بَاسِطًا ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ
۳ ۸ ۳ ۱ ھ

